خصوصی
غالب اور غربت
قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے

حیات و کائنات کا ترجمان

سرورق ۔ علی جلال

مدیر

سبط اختر

قیمت فی کاپی (مغربی پاکستان میں)

۵۰ پیسے

سالانہ تین روپے

(مشرقی پاکستان میں) ذریعہ ہوائی جہاز

فی کاپی ۳۵ پیسے

سالانہ چار روپے

ناشر سبط اختر

طابع:-
مشہور پریس کراچی

پتہ:-
ایرویز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ
کراچی ائیرپورٹ

فون:- ۴۱۹/۲۰۱۱ ۲

قائم شدہ ۱۹۴۱
پہلا سبق
روپیہ بچایئے، کل کام آئیگا
حبیب بینک لمیٹڈ
پاکستان میں ۵۰۵ سے زائد شاخیں

گول میز کانفرنس ـــــــ ایک دھوکا

۷ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو کراچی کے باشعور طالب علموں کی جماعت نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے طلباء کے مطالبات کو حل کروانے کیلئے "ہفتۂ مطالبات" کا آغاز کیا تھا اسی زمانے میں حکومت وقت بھی انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ جشن دس سالہ کے سلسلے میں سرکاری سطح پر ہفتۂ تعلیم منارہی تھی، لیکن مرکزی وزیر قانون، صوبائی وزیر اطلاعات اور ریڈیو پاکستان کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو ان کھوکھلی تقریبات کے زمانے میں جس طرح جلسہ گاہوں سے منہ چھپا چھپا کر بھاگنا پڑا تھا وہ طلباء برادری کی طاقت اور بیدار مغزی کا ایک ٹھوس اور تاریخی ثبوت ہے۔ طالب علموں کی اس تحریک کو چلے ہوئے ابھی چار پانچ ہفتے ہی گزرے ہوں گے کہ جابرانہ ادھراج نے این ایس ایف کے صدر رشید حسن خان اور ان کے رفقاء کار کے ساتھ ساتھ عوامی رہنماؤں پر انتہائی گھناؤنا وار کر ڈالا ـــ اس کے بعد کیا کچھ نہ ہوا ـــ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی ! اہل وطن کے عزم و عمل سے تاریخ وطن نے جو موڑ کاٹا وہ ہم سب کے لئے باعث مسرت ہے۔ ملوکیت کا بلند ترین کنگورہ اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا۔ اس مختصر سی مدت میں اپنے دلیس کے جیالے سپوتوں نے بیک وقت چھوٹے سے چھوٹے گاؤں اور بڑے سے بڑے شہر میں جس طرح صدارتی نظام کے تخت و تاج اچھالے ہیں اس طرح نہ تو مغربی یورپ کے کسی ملک میں اچھالے گئے اور نہ ہی سیاسی بیداری کی حالیہ تحریکوں میں نظر آئے۔ یہ در اصل ایک فطری ردّ عمل تھا۔ ایک عوامی انتقام تھا جو بلاشبہ اپنی مثال آپ ہے۔

ابتدا ً بات شعبۂ علم اور طالب علموں سے شروع ہوئی تھی مگر مطالبات کی نوعیت اور حالات کی شدت نے اس بات کو اتنی ہمہ گیری بخشی کہ سارے شعبہ ہائے زندگی اور تمام اہل پیشہ اس تحریک سے منسلک ہوگئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بقول شاعر گیدڑ چنگھاڑ کے اور مرغے بھی کلمۂ حق پکارے بولنے لگے۔

اب بظاہر حالات بڑے پُر سکون ہیں۔ ہر طرف امن اور شانتی ہے، بلکہ بہت سے سوئے باز تو کچھ اس انداز سے بات چیت کررہے ہیں کہ جیسے اس دھرتی پر کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ لوگ "پرانی رنجشیں اور کدورتیں" دور کرنے کی تلقین کررہے ہیں۔ حکومت اور صدر مملکت کی پالیسیوں کا طبقاتی تجزیہ کرنے سے روک رہے ہیں حکومت کے ظالمانہ کردار کو بھلا دینے کی نصیحت کررہے ہیں۔ صدر ایوب کے چمچوں اور کفگیروں کو دن دہاڑے بُرا بھلا کہنے والے ـــ ان کی سیکولرشی کی مدت کے خاتمے تک اب خود کاسہ لیسی پر اُتر آئے ہیں۔ ان کی معزولی کا مطالبہ کرکے عوامی ہمدردیاں جیتنے والے بازیگر اب ان کی دانشمندی کے گن گانے میں لگے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس گول میز کانفرنس نے، جس کو ہر حالت میں، عوام کی طرف سے، ان کے حقوق غصب کرنے والوں کے خلاف منصفانہ محاسبہ کا پلیٹ فارم بننا چاہئے تھا اب گندم نما جو فروشوں کی بدولت صدر ایوب کی مشاورتی کونسل کا روپ دھار لیا ہے۔ ہمیں گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے والے تمام افراد کی نیتوں پر شک نہیں ہے بلکہ ہم تو یہ تک کہنے کے لئے تیار ہیں کہ اس کانفرنس میں ذرا ایک آدھ ڈھنگ کا جو آدمی پہنچ گیا ہے اگر وہ بھی
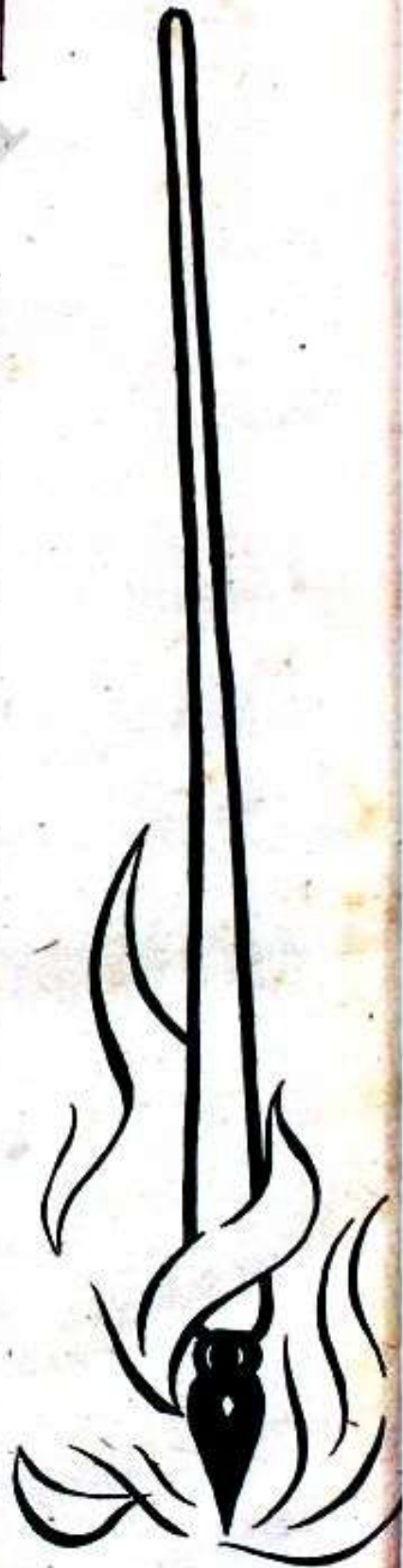
نہ پہنچتا تو پھر اندر کے راز سدا راز ہی رہتے۔ اب کم از کم ضمیر فروشوں کے دل کو بھانڈا پھوٹ جانے کا دھڑکا تو لگا رہے گا۔ ممکن ہے کہ اس مکروہ کاروبار کے دلال اپنی صفائی میں یہ دلیل پیش کریں کہ وہ تو ان کی شرکت کے بھی خواہاں ہیں جنہوں نے گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کیا ہے۔ تو ہمارے نزدیک یہ دلیل بھی بودی اور پھسپھسی ہے۔ بائیکاٹ کرنے والوں کی شرکت کے لئے آمادگی کا اظہار تو اس امر کا غماز ہے کہ سودے بازی میں سب کو شریک کر لیا جائے۔ بصورت دیگر یہ سودا کرنا ہی مہنگا پڑ جائے گا۔ اور اگر کسی نے پھر بھی یہ مہنگا سودا کرنے پر احمقانہ اصرار کیا تو تاریخ ماضی کی خامیوں سے بچتے ہوئے اپنے آپ کو از سر نو دہرانے کیلئے تیار کھڑی ہے۔

گول میز کانفرنس کے متعلق مجنونانہ حد تک الفت یا نفرت کے جذبات کا اظہار کرنا اعصابی خلل کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ایک غلط بات کو غلط کہنے کے بجائے صحیح کہنے کی حماقت کا ارتکاب کیا جائے۔ بنیادی پہلو یہ ہے کہ گول میز کانفرنس سے پہلے پہلے عوام کے مختلف محاذوں سے متعدد مطالبات اٹھائے گئے تھے جنہیں راج سنگھاسن پر بیٹھنے والوں نے آنکھیں بند کر کے انتہائی درندگی اور گھٹیا پن کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ بدترین قسم کے منظم تشدد کا مظاہرہ کر کے سرمایہ دارانہ وحشت، جاگیردارانہ بربریت اور نوکرشاہانہ فسطائیت کے نمونے پیش کئے تھے۔ مگر جب ان تمام ہتھکنڈوں سے خوفزدہ ہونے کے بجائے سرفروشوں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے منصوبے بنائے اور اتحاد و تنظیم کو عمل بھی کر ڈالا تو عوام کے انہی تیکھے تیوروں سے سٹپٹا کر حکومت نے اپنا سارا تھوکا ہوا چاٹنا شروع کر دیا بھی تھوڑا سا ہی تھوک چاٹا گیا تھا کہ لیٹرے طبقوں کے پیشہ ور شاطروں نے گول میز کا پتا پھینک دیا۔ بساط پرانی تھی، چال پرانی تھی۔ کھیلنے والوں نے کھیل کر جاگیرداری، اجارہ دار سرمایہ داری، نوکر شاہی اور سامراجیت کے برسر اقتدار اور محروم اقتدار ٹٹوؤں نے اپنے طبقاتی مفاد کا تحفظ کرنا شروع کر دیا ہے اور اصولوں کے تاجر اگر یہ سب کچھ نہ کرتے تو کیا کرتے کہ معاملہ اب ناک کا نہیں بلکہ غاصب طبقوں کے معاشی مفادات کا آن پڑا تھا۔ لہٰذا اسی لئے ایک دوسرے کے وجود سے نفرت کرنے والے اس طرح شیر و شکر ہونے چلے ہوئے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد تمیز و تخصیص کرنا بھی ممکن نہ ہو سکے گا۔

گول میز کانفرنس کی وکالت کرنے والے کچھ معصوم ذہن اور ساتھ ہی ساتھ براہ راست منسلک شاطران وقت انتہائی سادگی سے یہ پوچھتے نظر آتے ہیں کہ اگر مفاہمت اور اتفاق کا یہ راستہ اختیار نہ کیا جاتا تو پھر آخر کون سا راستہ رہ گیا تھا؟ پہلی بات تو اس سلسلے میں یہ ہے کہ یاران طریقت منطقی طور پر اور لاشعوری طور پر مفاہمت اور اتفاق — یا ان جیسے دوسرے الفاظ کو استعمال کر کے از خود اس امر کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس پوری تحریک کی اگوائی انہوں نے نہیں کی تھی۔ اگر وہ میر کارواں ہوتے یا اس تحریک کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتے تو اس طرح بے بسی یا مکارانہ رویئے کا اظہار نہ کرتے۔ کیونکہ آج مذکورہ تحریک کا ہر پرخلوص اور باعمل کارکن اس حقیقت سے واقف ہے کہ جس طرح پاکستان کے چپے چپے سے تعلق رکھنے والے عوام نے تحریک کے دوران ثابت قدمی اور مردانگی کا ثبوت دے کر آمر مطلق کو جزوی مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور کیا تھا بالکل اسی طرح عوامی یلغار کے سامنے تمام مطالبات بھی تکمیل پذیر ہوتے اور انھیں لوگوں کے ہاتھوں ہوتے، جنہوں نے ان مطالبات کو اپنی خودغرضانہ حکمت عملیوں کی وجہ سے مطالبات کا رنگ و روپ بخشا تھا۔

کہنے والے تو یہ بھی کہیں گے کہ ٹھیک ہے اب گول میز کانفرنس میں بیٹھ کر سب کچھ طے ہو جائے گا۔ ناک یوں پکڑ و یا یوں پکڑو، ناک ہی تو پکڑنی ہے جس طرح چاہو پکڑ لو۔ کہنے والوں کا یہی کہنا ان کی بدنیتی کا ثبوت ہے۔ کیونکہ اول تو یہ ناک پکڑنے کا مسئلہ نہیں اور اگر ناک پکڑنے کا ہی مسئلہ ہے تو سیدھے سیدھے ناک کیوں نہ پکڑی جائے، خوانخواہ گردن کے چاروں طرف ہاتھ کو گھما کر ناک کیوں پکڑیں۔ یہ بحث اس لئے نہیں ہے کہ منہ یا ہٹ دھرمی یا بچپن کا کوئی چکر ہے بلکہ بات یہ ہے کہ اس امر کے پورے پورے امکانات ہیں کہ جتنی دیر میں گردن کے چاروں طرف ہاتھ گھما کر لایا جائے گا اتنی دیر میں ناک کو بچانے کے لئے گردن کو گھما لینے کا بھی خطرہ ہے اور گردن کے گھومنے کے بعد ناک محفوظ ہو جاتی ہے اور بمشکل تمام گرفت میں آ بھی جائے تو پھر یہ گرفت اتنی مضبوط نہیں ہوتی جتنی کہ حالات کے تقاضے کے مطابق ہونی چاہئے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ ایک ایسا فرد اور ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ، جن پر عوام انتہائی ولولہ انگیز انداز میں اتحاد و یکجہتی کا بے مثال مظاہرہ کرتے ہوئے صد فی صد عدم اعتماد بلکہ دلی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے ہیں — آخر اس اعزاز و احترام کے مستحق کیونکر ہو سکتے ہیں کہ ان کو عوام کی بہتری کے موضوع پر اپنے اختیارات استعمال کرنے کا موقع دیا جائے۔

اور یہ بات بھی واضح اور روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس نام نہاد کانفرنس کے ذریعے عوام کے تمام ترین معاشی مطالبات کو

گزشتہ پانچ مہینوں کی سیاسی سرگرمیوں نے اپنے مقاصد و رجحانات کے لحاظ سے اب واضح اور باقاعدہ رُخ اختیار کر لئے ہیں۔ سرسری طور پر تو یہ نظر آتا ہے کہ تین سیاسی قوتیں سرگرم عمل ہیں یعنی ایک حکمران پارٹی دوسری اس حکمران پارٹی کے ساتھ مصروف گفتگو مجلس بے عمل اور تیسری وہ تمام پارٹیاں اور حلقے جو اس گفتگو کے خلاف ہیں۔ آخری تجزیہ کے حساب سے تین سیاسی قوتوں کی یہ درجہ بندی بھی ابھی عارضی ہی ہے، کیونکہ گفتگو میں شامل لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس گفتگو میں سودے بازی کے خواہش مند لوگوں کے لئے حلق کا کانٹا بن جائینگے۔ اسی طرح گفتگو میں غیر شامل لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو اگر حکومت چاہے تو دھاگے سے بندھے چلے جائیں گے۔ لہٰذا عملی شکل و صورت ابھی ذرا اور تبدیل ہو گی لیکن متوقع تبدیلیوں سے قطع نظر موجودہ صورتحال کا اگر ہم ذرا بنظر غائر مطالعہ کریں تو یہ سیاسی سرگرمیاں سہ رخی یا سہ پہلو نہیں بلکہ صرف اور صرف دو رخی اور دو پہلو ہیں۔ یہ تقسیم، طبقاتی بنیاد پر ظالم و مظلوم کی تقسیم ہے۔ ظالم، لیٹرے اور حق مارنے والے اپنی خود غرضی، منافع خوری اور بے حسی کی وجہ سے باہم ٹکراتے اور رشتے جھگڑتے نظر آتے ہیں مگر جیسے لٹنے والے مظلوم اور حقدار اپنے مشترکہ درد و غم کی بدولت متحد و منظم ہونے لگتے ہیں تو پھر سارے غاصب اور چور اُچکے بھی باہم مل بیٹھتے ہیں۔ ہمارے اس دعوے کی تصدیق موجودہ حالات سے ہی نہیں بلکہ مستقبل کے واقعات سے بھی ہو جائے گی جہاں تک ہمارا اپنا تعلق ہے یہ ساری باتیں ہم ایک زمانے سے کہہ رہے ہیں اس لئے موجودہ صورت حال کے سلسلے میں ہمیں کسی قسم کی کوئی ذہنی الجھن نہیں ہے، وہ لوگ جو ایماندار، محب وطن، پرخلوص اور محنت کرکے حلال کمائی کمانے والے ہیں، یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کرلیں کہ معاشی مفادات کے اشتراک و اتحاد سے ہی نظریاتی اور سیاسی اشتراک و اتحاد جنم لیا کرتا ہے اور نظریاتی و سیاسی وحدت سے ہی تنظیمی و عملی وحدت کی راہ کھلتی ہے۔ اسی بنیاد پر ہمارا یہ کہنا ہے کہ پیداوار اور ذرائع پیداوار پر قابض طبقے خواہ وہ برسر اقتدار ہوں یا محروم اقتدار، بہرطور ایک ہی ہوتے ہیں ان کی فکر، ان کی سوچ اور ان کا عمل، سب کچھ ان کے اپنے طبقاتی مفاد کے تحفظ کیلئے ہوا کرتا ہے اور ہوگا۔ یہ اپنے طبقاتی مفادات کے تحفظ کیلئے تشدد بھی کرتے ہیں، بے ایمانی بھی کرتے ہیں، دھوکے بازی بھی کرتے ہیں اور عوام کی قربانیوں سے پروان چڑھنے والی تحریکوں کو بھینٹ چڑھا کر سودے بازی بھی کرتے ہیں اور کریں گے۔ یہ حقائق جانے پہچانے ہیں۔ یہ کسوٹی آزمائی اور پرکھی جا چکی ہے۔ اگر ہمیں تاریخ وطن کو ایک نئی غداری کے صدمے سے بچانا ہے تو غداروں کے اس زہر سے بچنے کیلئے "تنظیم" — کے تریاق کو استعمال کرنا ہوگا۔

عوام کتنے ہی باشعور، کتنے ہی جیالے اور کتنے ہی باعمل کیوں نہ ہوں اگر وہ تنظیم کے ہتھیار سے محروم ہیں تو یقینی طور پر مات کھا جائیں گے۔ تنظیم صرف دشمن کے وار سے بچنے کیلئے ہتھیار ہی نہیں بلکہ کامیابی کی ضامن بھی ہے۔ تنظیم کا مطلب صرف یہ ہرگز نہیں ہے کہ مزدور، کسان، طالب علم، دانشور اور تاجر اپنی اپنی آہنی تنظیموں میں منظم ہو جائیں بلکہ تنظیم کا مطلب یہ بھی ہے کہ یہ تمام انقلابی طبقے اور حلقے اپنے ہی طبقے کے افراد کی قیادت میں منظم ہوں۔ اگر کسانوں کی تنظیموں کے رہنما جاگیردار اور مزدوروں کی یونینوں کے قائد سرمایہ دار ہوں تو ظاہر ہے کہ انجام کیا ہوگا؟ لہٰذا اس بھیانک انجام سے بچنے اور بچانے کیلئے طبقاتی اور دوسری پیشہ ورانہ تنظیموں کو اسی طبقے کے بہادر اور ذہین، فطرتاً سرگرم، بے لوث، ایماندار اور انقلابی افراد کی زیر قیادت منظم ہونا چاہئے۔ قیادت اور تنظیم کا یہ باہمی رشتہ بھی کافی نہیں ہے۔ کامیابی اور سرخروئی کی ضمانت یہ ہے کہ یہ تنظیمیں اور رہنما عوام سے اپنا زندہ تعلق قائم رکھیں اور ان کی تنقید کی روشنی میں اپنی غلطیوں کو درست کرتے رہیں کہ تنقید و خود تنقید

کا یہ اصول تمام منفی پہلوؤں اور تنظیمی خامیوں اور نظریاتی کجرویوں کا تریاق علاج ہے۔ یہی وہ اصول ہیں جن پر اگر ابھی سے عمل شروع کر دیا جائے تو دورِ حاضر کے جعفر و صادق کو ان کی اپنی اپنی کمین گاہوں میں باسانی دفن کر دیا جائے گا۔ ان سطور سے یہ مراد قطعی نہیں ہے کہ موجودہ سیاسی واقعات بغیر کسی تنظیمی منصوبہ بندی کے ظہور پذیر ہو گئے ہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بیس سال کے جابرانہ انتظامی ڈھانچے کے باوجود موجودہ طبقاتی اور پیشہ ورانہ تنظیموں نے جو تاریخی کردار ادا کیا ہے اور جس طرح غرور و تکبر کا سر نیچا کیا ہے اس پر اہلِ وطن جتنا فخر کریں کم ہے۔ مگر یہاں تنظیمی پہلو پر خصوصی توجہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تنظیم کے میدان میں ہم بہت ہی پیچھے ہیں۔ اگر آج، مزدوروں، کسانوں، طالبعلموں اور جوانوں، عورتوں اور عوام سے تعلق رکھنے والے تمام شعبوں میں ملک گیر سطح پر منظم، باعمل اور بے داغ تنظیمیں ہوتیں تو کیا یہ ممکن تھا کہ ایک ایسے

وقت میں جبکہ عوام میدان میں ڈٹے ہوئے اور سر پر کفن باندھ کر آگے بڑھنے کے لئے تیار ہیں کچھ عوام دشمن پٹے ہوئے مہرے اور پرانے سیاسی مہرے باہمی گٹھ جوڑ کے لئے جمع ہو جاتے؟

اگر ایک فرد جوشِ جنوں میں جنگل و بیاباں میں ممکن ترین تیز رفتاری کے ساتھ دوڑتا پھرے تو دنیا والے اسے پاگل اور ناقابلِ توجہ سمجھتے رہتے ہیں لیکن اگر یہی فرد ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق کسی اسٹیڈیم میں مقررہ اصولوں اور قواعد و ضوابط کے مطابق، دوسروں سے مقابلہ کرنے کے لئے سفید لکیروں پر دوڑے تو دنیا والے اسے چیمپئن قرار دے دیتے ہیں۔ ہمیں جوش جنوں کی ضرورت ہے، مگر عقل کی رہنمائی میں ضرورت ہے، تنظیم کے ساتھ ضرورت ہے، طے شدہ پروگرام اور منصوبہ بندی کے ساتھ ضرورت ہے۔ خالی عقل اب تک نہ کچھ کر سکی ہے اور نہ کر سکے گی۔ خالی جذبہ کبھی کبھار خود اپنا شکار بن کر رہ جاتا ہے اور عقل و جذبہ دونوں مل کر تو وہ تیر و کمان بن جاتے ہیں کہ ہر نشانہ ان سے پناہ مانگتا پھرتا ہے۔ عقل و جذبے نے تو بڑے بڑے قاہروں اور آمروں کے تخت و تاج اچھال دئے ہیں، ظلم و تشدد کی مضبوط ترین چکیوں کے پاٹ ریزہ ریزہ کر دئے ہیں۔ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ عوام نے اپنے شعور و وجدان اور اپنی تنظیم و عمل سے خود اس کو ــــ تاریخِ عالم کو جنم دیا ہے۔ ہاں تو پھر اے فرزندانِ وطن کے دلیرو، قدم سے قدم ملا کر چلو۔ صفوں کے پیچھے صفیں جما کر چلو، میمنہ اور میسرہ، قلب و مرکز اور ہراول دستے کو منظم کر کے چلو، کمک کا دھیان رکھ کر چلو، زادِ راہ کو ساتھ لے کر چلو اور اپنی تمام طاقتیں، تمام صلاحیتیں مجتمع کر کے چلو۔ ذرا بڑھو تو سہی، وہ دیکھو منزلِ مقصود تمہارے قدموں کو چومنے کیلئے بے چین و بیقرار ہے، ہاں تو پھر سب مل کر نعرے تو لگاؤ:

میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

بقیہ اداریہ

پس پشت ڈال کر انتظامی اور آئینی گتھیوں کو حل کرنے کے لئے شور مچایا جائے گا۔ بلکہ صحیح تو یوں ہے کہ یہ شور مچانا شروع کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے صدرِ مملکت کے لئے ایسی ایسی دل خوش کر دینے والی باتیں کی جا رہی ہیں کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ اب تو یہ بھی سننے میں آنے لگا ہے کہ موصوف اپنی طبیعت اور فطرت کے حساب سے بڑے اچھے تھے اور ہیں وہ تو ان کے چمچوں نے ان کا ستیاناس کروا دیا۔ گویا کہ اب یہ بات بھی منوائی جا رہی ہے کہ یہ قطعی گندے، بدبودار اور ٹوٹے ہوئے چمچوں کو جمع کر کے اور ان سے دسترخوان پر کھانا کھانے والا خود بے قصور رہا کرتا ہے۔ اصل قصور تو ان چمچوں کا ہی ہے جو نہ جانے کہاں سے اپنی بے وقعتی اور بدصنعی کے باوجود دسترخوان پر آ کودے تھے۔

یہاں اس وقت ہمیں ایک لوک کہانی یاد آ رہی ہے، کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک خوشحال گاؤں میں ڈاکوؤں نے چھاپہ مارا اور سب کچھ لوٹ کر لے گئے، واپسی میں لوٹ کے مال کی تقسیم ہونے لگی تو جھگڑا شروع ہو گیا۔ لیڈروں کے طاقتور گروہ نے کمزور گروہ کو مار بھگا دیا اور سارا مال خود ہتھیا لیا۔ لیڈروں کا کمزور گروہ ناکام و نامراد واپس گاؤں میں آیا تو اس نے دیکھا کہ گاؤں والے اپنے غصب شدہ سامان کو چھین لینے کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو رہے ہیں۔ یہ گروہ بھی چپکے سے ان میں شامل ہو گیا۔ جب گاؤں والوں نے لیڈروں کے طاقتور گروہ پر حملہ بولا اور وہ اپنی اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر بھاری پڑنے لگے تو لیڈروں کے طاقتور اور کمزور گروہ پھر آپس میں مل گئے اور گاؤں والوں کو یہ جھانسہ دیا جانے لگا کہ ہاں سارا مال تمہارا اپنا ہے لے لینا۔ چین سکون سے بیٹھ کر فیصلہ تو کر لو۔ اب بھلا ایسے موقع پر فیصلہ کس بات کا کرنا ہے؟ غصب شدہ مال کی واپسی کے سلسلے میں یہ "فیصلہ" کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا جب گاؤں والوں کا مال چھینا گیا تھا تو کسی بات یا کوئی کانفرنس ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ نہیں تو پھر اس موقع پر شطرنج کے ان مہروں کو بڑھانے کا آخر اس کے سوا اور کیا مطلب ہے

کہ جس طرح ذرائع پیداوار اور پیداوار کے غاصبوں، جاگیرداروں
اور سرمایہ داروں نے غلام محمد اور اسکندر مرزا کی بدفعلی کے سلسلے میں
باہمی سمجھوتے کرلئے تھے۔ بالکل اسی طرح اب موجودہ صدر کی سبکدوشی
پر محروم اقتدار اور برسراقتدار ظالم طبقوں اور ان کے سیاسی و قانونی
نمائندوں میں سودے بازی ہو جائے گی۔

ہم نے عوامی میلوں میں یہ دیکھا ہے کہ پیسے بٹورنے والے لکڑی
اور کاغذ کے بنے ہوئے مختلف جانوروں کے ڈھانچوں میں چھپ چھپ کر
انہیں جانوروں کے انداز میں آوازیں نکالتے ہیں۔ کبھی گھوڑے کا خول
پہن کر ہنہناتے ہیں تو کبھی اژدہے کا خول پہن کر پھنکارتے ہیں۔ مگر
اصلیت میں ہوتے پیسے بٹورنے والے ہی ہیں۔ کچھ یہی بات اب اس
گول میز کانفرنس کے بعد دیکھنے میں آئے گی کہ اژدہے کی طرح پھنکارنے
والے کا بھائی بند گھوڑے کے انداز میں ہنہنانے لگے گا۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں بدل بدل کر آنے والے ان نکموں، مفت
خوروں اور لالچ کے ماروں پر کڑی نظر رکھیں۔ معاشرے کو اندر ہی اندر
چاٹ ڈالنے والی معاشی، سماجی اور سیاسی دیمک کو مسل ڈالیں،
طبقاتی ناانصافی کو برقرار رکھنے کیلئے مذہب کے تقدس کو نقصان
پہنچانے اور منافع خوری کیلئے قرآنی تعلیمات میں تحریف کرنے والوں کا
احتساب کریں۔ یہ بڑی نازک گھڑی ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ اگر پرخار اور
پرپیچ راستے پر چلنے والے موجودہ قافلے کا کوئی فرد اپنے پاؤں میں چبھے
ہوئے کانٹے کو نکالنے کی خاطر ذرا ایک لمحہ کیلئے بھی رک کر بیٹھے گا۔ تو
قافلے سے سو سال کی مسافت کے فاصلے پر پیچھے رہ جائے گا۔

مارکوپولو

مشرق وسطیٰ

لبنان

لبنانیوں کے لئے بیروت ایئرپورٹ پر اسرائیلی حملے کا صدمہ اپنی غیرجانبداری کی خودفریبی کی وجہ سے شدید ہے ۔ وہ بڑی طاقتوں کے فرضی تحفظ میں بھی سختی سے یقین رکھتے تھے ۔ ان دو باتوں کے علاوہ ان کے پاس حیرت کا اظہار کرنے کیلئے اور بھی دلیلیں ہیں کہ ایتھنز میں اسرائیلی جہاز پر عرب حریت پسندوں کے حملے کے جواب میں بیروت ایئرپورٹ کو اس حملے کا ہدف نہ کیوں منتخب کیا گیا ؟

لبنان میں عرب حریت پسندوں کے تربیتی مراکز نہیں ہیں اور سرحد عبور کر کے اسرائیل میں داخلے کے واقعات بھی بہت کم ہوئے ہیں فلسطینی عرب حریت پسندوں کے حق میں عوامی حمایت کے مدنظر حکومت کو بھی رسمی طور پر اس تحریک مزاحمت کا احترام کرنا پڑتا ہے لیکن کسی کو بھی اس حکومت کی حقیقی رائے، یا تحریک مزاحمت کی امداد کے سلسلے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے ۔

حملہ جس رفتار سے کیا گیا وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسرائیل نے اس کا منصوبہ پہلے سے بنا رکھا تھا ۔ لیکن اس کا مقصد کیا تھا ؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ تمام ممکنہ نشانوں کے مقابلے میں بیروت ایئرپورٹ پر کم سے کم خطرے اور زیادہ سے زیادہ کامیابی کے حالات موجود تھے ۔ لیکن لبنان پر غصہ اتارنے کی اصلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ حملہ لبنان کو اندرونی خلفشار کا شکار بنا سکتا ہے ۔ اس حملے نے لبنان کو مجبور کر دیا کہ وہ عرب حریت پسندوں سے بالکل بے تعلقی کا اعلان کرے جس کا مطلب ملک میں اندرونی خلفشار ہوگا یا اپنا دفاع کرے ساوہ اس طرح بھی شدید ابتری نہ پھیلنے کے باوجود خلفشار ضرور پھیلے گا ۔ بہرحال اس صورتحال سے عوامی قوتوں کو جو فائدہ پہنچے گا وہ یہ ہے کہ لبنانی حکمرانوں کے غیرجانبداری کے نقاب کی دھجیاں بکھر جائیں گی عوام دوست اور عوام دشمن واضح طور پر علیحدہ علیحدہ صفوں میں بٹ جائیں گے ۔

اس تجزیہ کا واضح ثبوت یہ ہے کہ عوام میں تحریک مزاحمت اس قدر مقبول ہے کہ اس کے خلاف گفتگو صرف نجی محفلوں میں ہی سنی جاتی ہے انتہائی دائیں بازو کے رجعت پسند اخبارات بھی صرف اس حد تک لکھتے ہیں کہ حریت پسندوں اور لبنانی مسلح افواج ـــــــــ جو کہ آئندہ اسرائیلی حملے کا نشانہ بن سکتی ہے ـــــــ میں تعاون کی وکالت کرتے ہیں ۔ تحریک مزاحمت کا نعرہ صرف یہ ہے کہ ہر عرب ملک کو حملے کے خلاف ہر لمحہ تیار رہنا چاہیئے ۔

لبنانی حکمرانوں کی غفلت کا اندازہ اخبار " انہار " کے اس کارٹون سے لگایا جا سکتا ہے جس میں صدر ہیلو کو انتہائی عاجزی سے شکوہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے " میں ان کے لئے نہ مشرق سے متوقع تھا نہ مغرب سے ۔ اور سوائے وزیر مواصلات کے اور کون متوقع تھا ۔ وزیر مواصلات نے ایئرپورٹ کے دفاع کا ایک منصوبہ ضرور بنایا تھا جو کہ فوجی سربراہوں کے فوج بلانے کے تعجب خیز انکار کی وجہ سے روک دیا گیا ۔

اسرائیلی حملہ لبنانی قوم کے ہر طبقہ اور گروہ کیلئے پرل بندرگاہ پر نازی ہٹلر کے حملے کا درجہ رکھتا ہے ، لیکن ایک کاروباری ۔ سود خور معاشرہ راتوں رات سپارٹا میں تبدیل نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ ہی مجروح افتخار لوٹانے کی تنظیمی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے ۔

اب حکمرانوں کی طرف سے یہ گمراہ کن پروپیگنڈہ اچھالا جا رہا ہے کہ لبنان کے " مخصوص حالات " میں اس کا دفاع موجودہ غیرمحفوظ حالات میں ہو سکتا ہے لیکن اس میں بھی یہ مثبت پہلو مضمر ہے کہ اب تک لبنانی عوام کے ذہنوں میں حکمران طبقے کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہونگی ان کی بھی وضاحت ہو جائیگی ، اور حکومت اور فوج کا رجعت پسند کردار اور زیادہ ابھر کر سامنے آئے گا ۔

العاصفہ کی چوتھی سالگرہ

فلسطینی حریت پسندوں کی مسلح جدوجہد

یکم جنوری کو الفتح (فلسطین کی قومی جدوجہد آزادی کی تنظیم) کی

مسلح جد وجہد کرنے والی تنظیم العاصفہ کی چوتھی سالگرہ منائی گئی۔ یہ تقریب منانے کیلئے بغداد میں انتہائی انقلابی اور مجاہدانہ انداز میں ایک عوامی مظاہرہ ہوا۔ مظاہرے میں "انقلاب" آخری فتح تک انقلاب" کا نعرہ بار بار دہرایا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ العاصفہ کے حریت پسندوں نے یہ دن منانے کیلئے اپنے مورچوں پر اسرائیلی حملہ آوروں کو مسلسل شکستیں دیں۔ ۳۰ دسمبر سے یکم جنوری تک انہوں نے دشمن پر دلیرانہ دس حملوں سے زیادہ حملے کئے ان حملوں کے نتیجے میں بہت اہم اسرائیلی فوجی چوکیاں تباہ ہو گئیں اور حملہ آوروں کی بہت بڑی تعداد ہلاک یا زخمی ہو گئی۔

الفتح نے فلسطین کی آزادی کے لئے اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد یکم جنوری ۱۹۶۵ء کو اس وقت شروع کی جب اس نے العاصفہ منظم کرکے مقبوضہ فلسطین کے شمالی علاقے میں طبریس کے قریب لیبون کے ذخیرۂ آب رسانی کے نزدیک دشمن سے پہلی لڑائی لڑی۔ اس جنگ میں العاصفہ کے پاس صرف پندرہ حریت پسند، ایک مشین گن اور تیس دستی بم تھے۔ لیکن پچھلے چار برسوں کے دوران سیکڑوں جھڑپوں نے اس کی قوت کو مضبوط سے مضبوط بننے کے قابل بنا دیا ہے۔ اب مقبوضہ فلسطین کے ہر حصے میں ان کی جدوجہد جاری ہے۔

یکم جنوری کو الفتح نے قاہرہ میں کچھ اعداد و شمار شائع کئے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے چار سال کے دوران العاصفہ کے حریت پسندوں نے ۳۶۵۰ اسرائیلی سپاہیوں اور ۴۲ افسروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا انہوں نے ۶۵۸ فوجی گاڑیاں، ۵۷ موٹر کاریں، ۴۰ تیل کے ذخیرے، ۴۰ ہتھیاروں کے ڈپو، ۱۴، فوجیوں کے مرکز، ۲۳۱ بجلی کے مراکز، دو ٹینکریاں، چار فوجی ریل گاڑیاں، ۱۶ ہوائی جہاز، ۲۰ بیرونی چوکیاں، ۳۰ وائرلیس اسٹیشن اور ۹۵ پانی کے ذخیرے تباہ کر دئیے۔

العاصفہ کی مسلح جدوجہد کی چوتھی سالگرہ مناتے ہوئے عراقی اخبار "الثورہ" تبصرہ میں لکھا کہ "فلسطینی عوام نے صحیح راستہ اختیار کر لیا ہے جو انہیں فتح تک پہنچا دے گا انہیں یہ راہ الفتح نے دکھائی ہے — مسلح جدوجہد کی راہ — جو مسائل کا غلط حل پیش نہیں کرتی۔ جو نام نہاد پرامن حل تسلیم نہیں کرتی اور یہ بھی ہے کہ فتح حاصل کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے — جنگ"

مشرق بعید

جاپان

جون ۱۹۷۰ء میں امریکہ اور جاپان کے مابین باہمی تحفظ کے معاہدے پر نظرثانی کی جانے والی ہے۔ ایک معاہدہ جو دس کروڑ جاپانیوں کو ساختہ امریکہ نام نہاد "ایٹمی چھتری" کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے عالمی امن کی قوتوں کے خلاف امریکی سامراج اور جاپانی رجعت پسندوں کے اس گٹھ جوڑ کے خلاف مجاہد جاپانی عوام نے بھی اقدامات کرنے شروع کر دئیے ہیں کہ قومی سطح پر احتجاج کرکے اس کے تسلسل کو روکا جائے۔

رجعت پسند جاپانی وزیراعظم کیلئے یہ ایک بد فال ہے کیونکہ اسے ۱۹۶۰ء میں وزیراعظم کیشی کا انجام یاد ہوگا۔ کیونکہ باہمی تحفظ کے معاہدے کی تجدید کی مخالفت میں سخت عوامی مزاحمت کی وجہ سے کیشی کو مستعفی ہونا پڑا تھا۔ چنانچہ وزیراعظم ساتو کچھ عرصے سے امریکہ سے اس سلسلہ میں چند سفارتی مراعات کیلئے گڑگڑا رہا تھا۔ تاکہ وہ ان مراعات کے سہارے اپنی زندگی کی میعاد میں چند دنوں کا اضافہ کر سکے۔ امریکی سامراجی بھی جن کا عوامی جدوجہد سے دم نکلتا ہے اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں چنانچہ انہوں نے اس کی یہ درخواست قبول کر لی ہے۔

چنانچہ کئی مہینوں کی گفت و شنید کے بعد امریکی سامراج جاپان میں اپنے ۱۴۸ اڈوں میں سے ۴۹ کی جگہ تبدیل کرنے، ان سے دست بردار ہونے یا ان میں جاپان کی خود حفاظتی فوجوں کے ساتھ اشتراک کرنے کے لئے تیار ہو گیا ہے۔ بہت سے اڈے جو بیس برس پہلے ویران جنگلوں میں تعمیر کئے گئے تھے — خود رو شہروں سے گھر گئے ہیں، اور امریکی جیٹ طیاروں کی گھن گرج یا اتفاقی حادثے ان شہری آبادیوں کیلئے کھلا چیلنج ہیں اور یاددہانی کے لئے کافی ہیں کہ جاپان — بظاہر سہی لیکن حقیقت میں ایک نیم محکوم ملک ہے۔

لیکن ان انتظامات اور مراعات کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان سے واقع ہونے والی تبدیلیوں پر آنے والے تمام اخراجات جاپانی حکومت برداشت کرے گی۔ اور توقع یہ ہے کہ یہ اخراجات اتنے زیادہ ہوں گے کہ ان ۴۹ اڈوں میں سے زیادہ تر پھر بھی امریکی کنٹرول میں ہی رہیں گے۔

نیوزی لینڈ

نیوزی لینڈ کے دارالحکومت ولنگٹن میں طالب علموں نے امریکی وزیر خارجہ ڈین رسک کے خلاف جس نے ویتنام میں جارحیت کیلئے نئی اسکیمیں بنانے کے لئے اپنے کرائے کے ٹٹوؤں کو نیوزی لینڈ میں کام کیا تھا زبردست مظاہرہ کیا۔ جیسے ہی وہ جہاز سے باہر نکلا اسے مظاہرین نے گھیر لیا۔ جو "امریکیو ویتنام سے نکل جاؤ" کے نعرے لگا رہے تھے۔ وہ خوفزدہ ہو کر مظاہرین سے بچ کر جلدی سے ایئرپورٹ سے بھاگ نکلا۔

طالب علموں نے ویتنام میں امریکی سامراجی جارحیت اور نیوزی لینڈ کی رجعت پسند حکومت کی طرف سے امریکہ کو اس سلسلے میں مدد کرنے کیخلاف ایک طویل مارچ کی مارچ بارہ دن جاری رہی اور اس دوران اس میں حصہ لینے والوں نے پانچ سو میل کا سفر کیا۔ پورے راستے مظاہرین نے لاتعداد پمفلٹ تقسیم کئے بہت سے شہروں میں مظاہرے کئے اور عوام میں ویتنام میں امریکی جارحیت کے خلاف پرچار کیا۔

آسٹریلیا

آسٹریلیا میں بہت سے موقعوں پر مظاہرین نے وزیر اعظم گورٹن کی رہائش گاہ اور ان مقامات کو گھیرے میں لے لیا جہاں وہ تقریر کر رہا تھا۔ انہوں نے آسٹریلیا کی رجعت پسند حکومت کے امریکہ کا ساتھ دینے کے خلاف مظاہرے کئے مظاہرین نے "آسٹریلوی فوجوں کو فوراً واپس بلاؤ" اور "ویتنام کے خلاف مجرمانہ جارحیت بند کرو" کے نعرے لگائے۔ آسٹریلوی نوجوانوں نے فوج میں جبری بھرتی کے خلاف بھی بہت سے شہروں میں مظاہرے کئے انہوں نے فوج میں جبری بھرتی کی توسیع اور آسٹریلوی نوجوانوں کو گولیوں کا نشانہ بننے کیلئے جنوبی ویتنام بھیجنے کی سرکاری پالیسی کے خلاف سخت احتجاج کیا انہوں نے جبری بھرتی کے خلاف آخر وقت تک جدوجہد کرنے کا عہد کیا اپنی جدوجہد میں حکام کی وحشت اور بربریت کا بہادری سے مقابلہ کیا اور تشدد کے لئے بھیجی جانے والی پولیس کے ساتھ زبردست لڑائیاں لڑیں۔

یورپ

اٹلی

اٹلی کے بہت سے شہروں میں نئے دن پر طلباء اور مزدوروں نے سرمایہ داری کی ہوس پرستی، اس کی تنزل پذیر تہذیب اور فن کے خلاف زبردست مظاہرے کئے۔

روم میں مزدوروں نے نئے دن کی خوشیاں منانے کے مقامات کا راستہ روک دیا۔ اور "بورژوا الذت پسندوں کے خلاف شرم شرم" کے نعرے لگائے نئے سال کی تقریب کے موقع پر ویاریجیو شہر میں کئی سو طالب علموں اور مزدوروں نے ایک نائٹ کلب کے سامنے مظاہرہ کیا جب حکام نے انہیں مظاہرہ کرنے سے روکنے کے لئے پولیس کی ایک بہت بڑی تعداد کو بلایا تو نوجوان مظاہرین نے گلی کوچوں میں رکاوٹیں کھڑی کرکے پولیس کا بہادری سے ڈنڈوں اور پتھروں سے مقابلہ کیا۔ یہ لڑائی دوسرے دن صبح تک جاری رہی۔ پولیس نے انتہائی درندگی سے مظاہرین پر فائرنگ کی جس میں ایک سولہ سالہ نوجوان سخت زخمی ہو گیا۔ اس سلسلے میں پولیس نے پچاس مظاہرین کو گرفتار بھی کر لیا۔

رجعت پسند حکام کے نئے فاشی ہتھکنڈوں نے عوام میں سخت بے چینی پھیلا دی ہے۔ حکام کے اس بے رحم رویئے کے خلاف احتجاجی مظاہروں نے اٹلی کے بہت سے شہروں کو ہلا دیا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ تین ہزار سے زیادہ طالب علموں اور مزدوروں نے ۲۶ دسمبر کو موسم سرما کے استقبال کی تقریب کے خلاف ایک شاندار مظاہرہ کیا۔ مظاہرین نے پمفلٹ بھی تقسیم کئے جن میں سرمایہ داروں کی ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کے اس وقت "شرمناک دکھاوے" کی مذمت کی گئی ہے۔ جبکہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔

طالب علموں اور مزدوروں نے تھیٹر کا محاصرہ کر لیا اور ان کے انقلابی نغموں کی دھنوں نے تھیٹر سے ابھرنے والی ذہنوں کو پراگندہ کرنے والی موسیقی کی آوازوں کو دبا دیا۔ انہوں نے تقریب میں شامل سرکاری حکام اور دوسرے خون چوسنے والوں پر گندے انڈے پھینکے اور پولیس کی بہت بڑی تعداد سے لڑتے ہوئے تھیٹر میں گھس گئے۔

اٹلی کی عوامی تحریک کا روز بروز شدت پکڑنے والا طوفان اٹلی کے سیاسی۔ معاشی بحران اور تیز ہوتے ہوئے طبقاتی تضاد کا لازمی نتیجہ ہے۔

سرمایہ دار دنیا میں مالی بحران کی شدت اور ضرورت سے زیادہ پیداوار کے بحران کی وجہ سے اٹلی کی صنعتی پیداوار کی رفتار بہت دھیمی ہو گئی ہے۔ ۱۹۶۹ء کے ابتدائی سات مہینوں کے مقابلے میں ۱۹۷۰ء کے انہی مہینوں میں پیداوار کی رفتار آدھی سے بھی کم ہو گئی تھی۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے بین الاقوامی مقابلے میں اٹلی کی بیرونی تجارت میں بھی تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے۔

اٹلی میں شدید جدوجہد طالب علموں، مزدوروں اور کسانوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد کو تعلیم دے رہی ہے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ روبہ زوال سرمایہ داری نظام ہی تمام سماجی برائیوں کی جڑ ہے۔ اور اس جبر اور استحصال کو ختم کرنے کیلئے اجارہ دار سرمایہ دار طبقہ کے خلاف سخت جدوجہد کرنا انتہائی ضروری ہے جس نے اس نظام کو قائم اور محفوظ کر رکھا ہے۔ نتیجتاً انہوں نے اپنے بنیادی حقوق کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ رجعت پسند اجارہ دار سرمایہ دار طبقے کی حکمرانی کے خلاف جدوجہد شروع کر دی ہے اور انتہائی بہادری سے بورژوا "قانون کی حاکمیت" کو للکارنا شروع کر دیا ہے۔

اقوام وطن —— لہو کی پکار

"خونی فرشتے"

ایک برطانوی ڈرامہ نویس کرنراڈ براؤن کے ایک نئے ڈرامے کی اشاعت

کی وجہ سے کانگو کے ہنگامہ خیز دنوں کی یادیں تازہ ہو گئی ہیں جبکہ بائیں بازو کا جوشیلا لیڈر لومبا انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ اوبرائن نے اپنے اس ڈرامے میں اس زمانے کے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل ہیمرشولڈ پر لومبا کے قتل کو نظر انداز کرنے کا الزام لگایا ہے۔

ڈاکٹر اوبرائن مئی ۱۹۶۱ء کے بعد کئی مہینوں تک ایلزبتھ ول — اس وقت کے علیحدگی پسند کانگو — کٹنگا کی ریاست کے دارالخلافے میں ہیمرشولڈ کے نمائندے کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔

ڈرامے کے دیباچے میں کہا گیا ہے کہ "خونی فرشتے" کا مرکزی خیال یہ ہے کہ قابل وقعت اور قابل یقین وجوہات کی بنا پر اور انسانیت کی خدمت کے جذبے کے ساتھ ہیمرشولڈ لومبا کے زوال کا سبب بنا اور اس نے لومبا کے قتل کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی جو نتیجتاً خود اس کے اندھا دھند زوال اور قتل کا باعث ہوا۔

ڈرامے کا مقام کانگو ہے اور وہ جولائی ۱۹۶۰ء جب اقوام متحدہ کی فوجوں نے پہلی بار کانگو میں مداخلت کی، سے ستمبر ۱۹۶۱ء کے دوران کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے، جب ہیمرشولڈ رہوڈیشیا میں ایک ہوائی حادثے کا شکار ہوا۔

ڈرامے میں ہیمرشولڈ اس بات سے قطعی اتفاق کرتا ہے کہ اگر امن برقرار رکھنا ہے تو لومبا کا قتل لازمی ہے۔ اور اس کے بعد وہ اقوام متحدہ کی فوج میں کسی ماتحت کو ٹیلیفون کرتا ہے کہ کٹنگا والوں کے ہاتھ آنے کے بعد لومبا کا جو بھی حشر ہو، اقوام متحدہ کی افواج کسی بھی حالت میں مداخلت نہ کریں۔

دونوں موتیں اسٹیج سے پرے واقع ہوتی ہیں۔ اور ڈرامے کی یہ خصوصیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ڈاکٹر اوبرائن کے دماغ پر لکھتے وقت پرانے یونانی المیے اور ان کی روایات کا کافی اثر تھا۔ ابتدائیہ میں ایک یونانی اسٹائل کا کورس بھی استعمال کیا گیا۔ اور ڈرامے کے مرکزی کردار ہیمرشولڈ اور لومبا بھی یونانی المیوں کے مرکزی کرداروں کی یاد دلاتے ہیں — کہ اگر اول الذکر کے لئے ہر قیمت پر امن ضروری ہے تو دوسرے کیلئے ہر قیمت پر قومی آزادی ضروری ہے۔ دونوں کا اپنی اصلی شخصیتوں سے زیادہ اپنے اصول پیارے ہیں۔

ڈاکٹر اوبرائن کا کہنا ہے کہ میں خود کو ان معاملات کے بارے میں قطعی طور پر غیر جانبدار ذریعۂ اطلاع نہیں سمجھتا ہوں۔ اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے میں نے کافی جدوجہد کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرا ڈرامہ جذباتی انداز میں واقعہ کی حقیقی عکاسی ہے

— — —

بدترین اندھا پن دل کا اندھا پن ہے ــــــ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

میرا منہ ہمیشہ سچ بولتا رہے گا، میرے ہونٹ ناپاکوں پر نفریں کرتے رہیں گے ــــــ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

تجربوں کو یاد رکھنا عقل حاصل کرنے کا دوسرا نام ہے ــــــ حضرت علی رض

صادق کی محنت زندگانی کا باعث ہے، شریر کی اقبال مندی گناہ کراتی ہے ــــــ حضرت سلمان رض

فسانہ وہ نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ قائدہ وہ ہے جو بنیاد کا پتھر بن کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے سینے پر عمارت کے قیام اور اس کے استحکام کی ضمانت قبول کرتا ہے ــــــ بہادر یار جنگ رح

انسان جب کھائیوں، سڑکوں، ملوں اور زمینوں کی تقدیر بدل سکتا ہے تو کیا اپنی تقدیر نہیں بدل سکتا؟ ــــــ کرشن چندر

آدمی کو چاہیے کہ اپنی غلطیاں بروقت سمجھ لے اور شعوری طور پر ان کو ٹھیک کرے ــــــ رشید دف

بچپن زندگی کی صبح ہے ــــــ سلٹن

اس سے پہلے کہ سانپ پھن اٹھائے اُسے مار دو ــــــ مہدی سوڈانی

انصاف وہاں ہی حاصل ہو سکتا ہے جہاں طالب انصاف اپنے بازوؤں میں حصول انصاف کی طاقت رکھتا ہے ــــــ نامعلوم

زمین سے ہمارا تعلق چند گز سے زیادہ کا نہیں اس سے آگے پاؤں پھیلانا دوسرے کا حق ہمسائگی غصب کرنا ہے۔

"زندہ رہنا اور دوسروں کو زندہ رہنے دینا" یہ ہے اصل بنیاد عمران و تمدن کی۔ اس اصول سے ہٹ کر آپ سرمایہ دار بن سکتے ہیں، پیر خانقاہ ہو سکتے ہیں، ناظم و مدرس ہو سکتے ہیں۔ لیکن انسان بننا مشکل ہے ــــــ نیاز فتحپوری

محبت ہمیشہ اپنی گہرائیوں سے بے خبر اور ناآشنا رہتی ہے جب تک کہ جدائی کے لمحے اسے بیدار نہیں کرتے ــــــ جبران خلیل

زندگی کی بنیادی حقیقتیں اس بات کی منافی ہیں کہ کسی بھی قسم کے غیر سماجی تصورات انسان کے اندر جگہ پا سکیں، حقیقت بہرحال حقیقت ہے اس کو بدلا نہیں جا سکتا ــــــ لوئی اراگاں

اگر آپ کسی "ناقابل ہضم اور تلخ حقیقت" کا عدالت میں ذکر کرنا چاہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایسا کرنا قانونِ شہادت کے خلاف ہے اور نہ صرف جج اور مخالف وکیل بلکہ آپ کا وکیل بھی مذکورہ حقیقت کے اظہار کو روک دے گا ــــــ برٹرینڈ رسل

زندگی میں اور کوئی چیز عورت سے زیادہ لطیف اور معنی خیز نہیں ــــــ گورکی

جب تک ہم عوام کو، کروڑوں محنت کش لوگوں کو جد و جہد میں اپنے ساتھ نہیں لائیں گے تب تک ہماری فتح نہیں ہو سکتی ــــــ سنگولائی

جب تک کسی دانشور کا کتابی علم عمل سے ہم آہنگ نہ ہو جائے اس وقت تک اس کا علم نامکمل ہو گا۔ اور درحقیقت ابتدائی نامکمل رہے گا ــــــ

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

تھا سراپا رُوح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندّی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار

تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریّا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

علامہ اقبالؒ

نعیم آرزوی

وہ میرے دفتر کا پہلا دن تھا۔ حادثہ کچھ اتنا عجیب، دلفریب اور غیر متوقع تھا کہ میں کچھ دیر کے لئے ششدر رہ گیا۔ بات اتنی اہم اور سنگین بھی نہ تھی کہ میں بیٹھے کچھ سوچ لیتا۔ اگر دفتری زندگی کا پہلے سے کچھ تجربہ ہوتا تو شاید بات یوں نہ بگڑتی اور مجھے گھنٹوں منہ پھاڑے ہکا بکا، دیدم کی تصویر بن جانا پڑتا۔ اسٹیبلشمنٹ (ESTABLISHMENT برانچ (BRANCH) سے پوسٹنگ آرڈر حاصل کرنے میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ چونکہ مجھے اسی روز اپنی برانچ میں پہنچ کر رپورٹ کرنی تھی اس لئے وہاں سے سیدھے میکلوڈ روڈ روانہ ہو گیا جہاں میرا نیا دفتر تھا۔ میکلوڈ روڈ کے ایک چوراہے پر بائیں جانب ایک تنگ سی گلی تھی۔ گلی کا نام شاید کراچی کے کسی مرحوم تاجر یا صنعت کار کے نام پر تھا۔ کوچہ حاجی امیر علی سوڈا واٹر والا مرحوم زندگی میں یقیناً ایک کامیاب تاجر رہے ہوں گے، کیونکہ مرنے سے قبل انہوں نے گلی کی تعمیر اور گلی کے اندر ایک وقف شدہ عمارت پر لاکھ روپے کے اخراجات برداشت کرکے اللہ میاں سے بھی کامیاب سودے بازی کی کوشش کر ڈالی تھی۔ پتا نہیں وہ اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوئے تھے، البتہ مدتوں کے بعد بھی گلی کے نکڑ پر پیتل کے ایک زنگ آلود ٹکڑے پر ۔۔ کوچہ حاجی امیر علی سوڈا واٹر والا ۔۔ کا نام ابھی تک زندہ تھا۔

پوری گلی ویران پڑی تھی، نیم تاریکی اور گہری خاموشی میں لپٹی ہوئی گلی بانجھ چہرے کی مانند سپاٹ، بے مصرف اور بے معنی تھی۔ گلی کے اندر کا ماحول بڑا سہما سہما سا اور اداس تھا، اندر جہاں گلی ختم ہوتی تھی کوڑے کا ایک بڑا سا ڈھیر رکھا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف ردی کاغذ، روٹی کے باسی ٹکڑے، جانوروں کی ہڈیاں، سگریٹ اور ماچس کی خالی ڈبیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک خارش زدہ کتا دیر سے پنجے مار مار کر پوری گلی کو دھواں کئے ہوئے تھا۔ گلی کے نکڑ پر ایک بڑے میاں ریڑھی پر حلوہ پوری بیچ رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک بوسیدہ بنچ پڑی تھی۔ جس پر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے بڑے انہماک اور رغبت سے حلوہ پوری کھا رہے تھے۔ ان کے چہرے اور ان کی آنکھوں میں، صدیوں کی بھوک کی اذیت ناک پرچھائیاں تھیں، وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر پوری کے بڑے بڑے نوالے حلق سے یوں نیچے اتارنے میں مصروف تھے کہ کہیں کوئی ان کے ہاتھوں کا نوالہ بھی نہ لے اڑے۔ میرے دیکھتے دیکھتے ان میں سے ایک آدمی کھانے سے فارغ ہو کر اٹھا، جلدی جلدی اپنی انگلیاں چاٹیں، چٹخارے لے کر دو تین بار پھنکارے لئے اور پتلون کی جیب سے تڑا مڑا کرنسی نوٹ نکالے اور بڑے میاں کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ پھر دو تین بار ڈکار کر حلوہ پوری کو لالچی نظروں سے دیکھتا ہوا میرے قریب سے گزر گیا، وہ شاید اسی دفتر کا ملازم تھا جہاں مجھے جانا تھا، کیونکہ وہ اسی عمارت میں داخل ہوا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب، بے ڈھنگا اور سخت اکتا دینے والا لگ رہا تھا، یہاں کی پوری فضا میں ایک خاص قسم کی بیچارگی اور کمینہ پن بسا ہوا تھا۔

میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا، آرٹ فوٹوگرافی کا دلدادہ، ادھر ادھر گھومنا اور لاپرواہی کی زندگی گزارنا جس میں کوئی ذمہ داری کا بوجھ اور اقتصادی الجھن نہ تھی۔ مگر والد کے اچانک انتقال سے پورے گھر کی ذمہ داری ایک دم مجھ پر آن پڑی تھی، اور مجھے یونیورسٹی کی علمی فضا اور آزاد دنیا کو اچانک خیرباد کہہ کر روزگار کا سہارا لینا پڑا تھا۔ رونق منزل کی تیسری منزل پر میرا دفتر تھا، رونق منزل نام کو رونق منزل تھی، پوری عمارت ایک ایسے ماتمی چہرے کی مانند جسے دکھ سہتے زمانہ بیت گیا تھا، جگہ جگہ سے بے رونقی اور اجاڑ پن کی کیفیت جھلک رہی تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ گلی میں ایک جانب دبکی ہوئی اس عمارت پر شاید کارپوریشن والوں کی نظر نہیں پڑی، ورنہ اس عمارت کو خطرناک قرار دے کر گرا دینے میں کارپوریشن کا عملہ ہرگز تکلف یا مروت سے کام نہ لیتا، رونق منزل کے سامنے حاجی امیر علی سوڈا واٹر والا کی وقف کی ہوئی بوسیدہ عمارت کے فلیٹوں کی چوڑی چوڑی بے ڈھنگی سیڑھیاں نیم تاریکی میں پرانے زخم کے سیاہ کھرنڈ کی مانند بدرنگ اور خطرناک دکھائی دے رہی تھیں۔ فلیٹوں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ہی پتا چل جاتا تھا کہ اس میں بلوچ، کاٹھیاواڑی اور بمبئی کے معمولی تاجر پیشہ میمن آباد ہیں۔ حیرت اس بات پر تھی کہ فلیٹ اور فلیٹ کے نیچے گلی میں اس آبادی کے باوجود خنودگی اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ جبکہ میمنوں، بلوچوں، کاٹھیاواڑی بچوں کو شروع ہی سے ہنگامہ، چیخ پکار اور شور شرابے میں گلا پھاڑنے کی معقول تربیت دے دی جاتی ہے۔ فلیٹ کی بالکونیوں پر لکڑی کی آڑی ترچھی جالیاں بنی تھیں جن میں کبھی کبھی کسی متحمل اور تیز طرار ناک نقشے والی عورت کی جھلک نظر آجاتی تھی، کہیں کہیں الگنی پر ریشمی شلواریں، سرخ رنگ کے دوپٹے، بچوں کے نیکر اور مردوں کے میل سے چکٹ بنیانیں سوکھنے کے لئے ٹنگے ہوئے تھے۔

رونق منزل کی سیڑھیوں پر بھی نیم شب کا اندھیرا تھا، میں دیوار کا سہارا لے کر اوپر چڑھا، پہلی منزل پر تین بڑے بڑے کمرے تھے۔ جن کی چھت لکڑی کی تھی جگہ جگہ سے بانس بندھے، ادھڑ کر نیچے جھول گئے تھے۔ دیواروں کا پلاستر ٹوٹ کر فرش پر بکھرا ہوا تھا، اور تاریک سنسان کمروں میں موٹے موٹے چوہے اطمینان سے ایک دوسرے کی رنگ رلیوں میں مصروف تھے۔ پرانی فائلوں کے بڑے بڑے بنڈلوں پر چوہوں نے خوب دانت تیز کئے تھے۔ کٹے پھٹے کاغذ، "فلیپ" اور "فائل کور" آدھے سے زیادہ کمروں میں بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ دوسری منزل پر سیڑھیوں کے قریب ہی ایک بڑی سی میلی کچیلی میز کے عقب میں مجھے ایک فربہ جسم کا آدمی بیٹھا ہوا ملا، اس کی آنکھوں پر بھاری شیشوں کی عینک تھی، عینک کے فریم پر میل جم رہا تھا اور کمانی کی جگہ اس نے موٹے موٹے دھاگے باندھ کر کانوں پر لپیٹ لئے تھے، وہ پہلے کئی لمحوں تک مجھے پہچاننے والی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"کہو بھائی کیا بات ہے۔"

میں نے اپنا پوسٹنگ آرڈر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اپنی عینک درست کی اور اسے غور سے پڑھنے کے بعد مجھ سے بولا۔

"پھر اسی بات پر چائے منگوالو۔"

"میں نے کہا چاچا۔ دفتر تو جوائن کر لوں، چائے بھی پی لینا۔"

"یہاں تم یہاں آ تو رہے ہو، مگر ایک بات کا خیال رکھنا، مجھے اردلی کرنا، چائے والے کا خیال رکھنا اور ہر روز حاضری رجسٹر کے ساتھ۔ بڑے دربار میں تمہاری پیشی ہوا کرے گی ——— تیسری منزل پر تیسرے کمرے میں چلے جاؤ، لیکن اس وقت کم از کم ایک آدھ سگریٹ تو پلا دو، بڑی دیر سے طلب لگ رہی ہے ——"

تیسری منزل پہلی اور دوسری منزل سے کہیں زیادہ اندھیرا تھا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے وہ شخص روشن منزل کی تاریکی کا ایک حصہ معلوم ہوا، بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا، اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک اور ہونٹوں پر گہری طنزیہ مسکراہٹ تھی، پہلے کمرے میں روا کاؤنٹس افسر (ACCOUNTS OFFICERS) اپنی لیمپ کی روشنی میں زرد ستارے کی طرح لرز رہے تھے، ان کی لمبی چوڑی میزوں پر فائلوں کے انبار تھے۔ پشت کی جانب لکڑی کے شیلف میں بھی مٹیالے رنگ کے فائل تلے اوپر رکھے تھے۔ ان کے سوکھے ساکھے چہروں پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ وہ بڑے انہماک سے فائل دیکھنے میں مصروف تھے۔ دروازے پر خاکستری رنگ کا ایک دبیز پردہ لٹک رہا تھا، کبھی کبھی پردہ ہٹتا تو اندر کا منظر ایک لمحہ کے لئے آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا، دوسرے کمرے میں بھی مجھے بے شمار فائلوں، اور کاغذات کے موٹے موٹے بنڈلوں، تختوں کے درمیان چار پانچ آدمی کام کرتے ہوئے نظر آئے، مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ قدکاٹھ، چہرے مہرے اور تاثرات کے اعتبار سے ایک ہی جیسے تھے، دُبلا پتلا جسم، ہانپتی کانپتی آواز موٹی موٹی عینک، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، بڑھے ہوئے بال، گھسی پٹی ریکارڈ کی سی آواز، بلغمی کھانسی، بار بار چائے کی طلب۔ اور سستے سگریٹوں کے لمبے لمبے کش ـــــــ "یار آج تو کٹ جاؤ۔ منگوا لو دو پیالی چائے تم کسی اور دن میرے ذمہ" ـــــــ دوسرے کمرے کی یہ آوازیں حریص بھی تھیں اور ملتجی بھی۔

میں اب اپنی برانچ کے سامنے کھڑا تھا۔ دروازہ آدھا کھلا تھا، نیم وا دروازے کی جھری سے اندر کا منظر خاصہ حوصلہ شکن تھا، اندر اندھیرا تھا، دروازے کے قریب ہی ایک بڑی سی میز کا نصف حصہ نظر آرہا تھا، جس پر ایک پتلا دبلا ہاتھ، پتلی پتلی، بے رنگ، بدوضع انگلیاں، بے چینی سے میز پر ٹھوکے دے رہی تھیں، کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ لمبی لمبی میزیں لگی تھیں، ان میزوں پر فائلوں کے بے شمار بنڈل ایک کے اوپر ایک رکھے تھے۔ ڈرافٹ پیپر اور نوٹ شیٹیں جگہ جگہ سے باہر جھانک رہے تھے۔ فائلوں کے انبار سے ایک شخص کا سر اُبھرا، اس نے میز پر قلم رکھا۔ دو چار بار جمائیاں لیں اور ایک لمبی انگڑائی کے بعد میز کے اوپر سے فائلوں کا ایک بنڈل کھینچا۔ اور زور سے اپنی میز پر پٹک دیا۔ فائلوں پر جمی ہوئی گرد کی چادر میں وہ چھپ گیا۔ گرد کی ہلکی ہلکی چادر میں اس کا چہرہ اور بھی زرد اور بیمار نظر آنے لگا تھا وہ زور زور سے کھانسنے لگا، پھر تھک کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، اس کا صرف سر مجھے باہر سے نظر آرہا تھا۔ فائلوں میں گم ہوگیا۔

"اُف توبہ ہے۔ یہ گرد تو جان لے کر رہے گی" اس جملہ میں اس کی آواز کئی بار ٹوٹی تھی۔

میں نے دروازے پر کھڑے کھڑے پیچھے مڑ کر دیکھا، آئیڈیل زندگی کو آنکھ مار کر کہا۔ جانِ من رخصت ہو جاؤ اب تو بقیہ زندگی "آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ" پڑھتے ہوگی، خواہ مخواہ میرے ساتھ رہ کر تمہیں پشیمانی ہوگی۔ بس اب تم لوٹ جاؤ ـــ اس دروازے تک ہمارا تمہارا ساتھ تھا، اس دروازے کے اندر ہمارا تمہارا، میل ملاپ کسی کو ایک آنکھ بھی نہ بھائے گا"

میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازے کا آدھا کھلا پٹ تیز چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ شاید دروازے کی تیز چرچراہٹ اندر بیٹھنے والوں کو بہت ناگوار گزری تھی۔ میں ان کے چہروں پر ناگواری کے اثرات صاف صاف دیکھ رہا تھا۔ ان سارے بے معنی اور سپاٹ چہروں پر ایک ہی سوال تھا جو ایک نئے سوالیہ چہرے سے جواب طلب کر رہے تھے۔ کمرہ کشادہ نہ تھا، اس کی شکل چوکور تھی، دیوار کے ساتھ ساتھ لمبی لمبی میزیں تھیں۔ اور ہر قدم کے فاصلہ پر ایک کرسی پر ایک کلرک بیٹھا ہوا تھا، افسر انچارج کی میز دروازے کے ساتھ ہی تھی، اس کی عمر چالیس پینتالیس کے درمیان ہوگی، لیکن دیکھنے میں وہ ساٹھ ستر سال کا بوڑھا معلوم ہوتا تھا، جس نے شاید اپنی زندگی کے بہترین لمحات اسی قبر میں گزار دیئے تھے۔ ہم اپنی اپنی قبروں کے خود ہی مجاور ہیں۔ ہاں آج پرانی قبروں کے درمیان ایک نئی قبر کا اضافہ ہونے والا ہے ایک نیا مجاور آیا ہے جو تمام عمر اپنی قبر کے سرہانے بیٹھ کر سینہ کوبی کرے گا، تم لوگ اُسے خوش آمدید کہو۔ مگر تمہارے چہروں پر یہ کیسی خاموشی ہے۔ کیسی بے تکی سوچ ہے جو منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا تمہیں میرے آنے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی، کیا تم لوگوں کو اس بات کا کوئی احساس نہیں کہ آج تمہاری آبادی میں ایک نئے شخص کا اضافہ ہوا جس کی سانسوں میں ابھی تک باہر کی فضاؤں کی تازگی، خوشگوار ہوا کی خوشبو بسی ہے، جو اپنے سینے میں زندہ رہنے کا حوصلہ اور اپنی آنکھوں میں سورج کی کرنوں کی ساری چمک سمیٹ لایا ہے، کہ اس نیم تاریک، نیم خاموش فضا میں زندگی کی لہر دوڑ لگے، لیکن یہ کیا، تمہارے چہروں پر جھنجھلاہٹ کیسی۔ آنکھوں میں کدورت اور کینہ توزی کیوں؟ تمہارے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ کیوں، تمہارے چہروں پر یہ بے معنی سوال کیوں؟"

کمرے میں کل آٹھ افراد تھے۔ چھ تو ادھیڑ عمر کے تھے دو نوجوان ہونے کے باوجود کھچڑی بال اور موٹی موٹی عینکوں کی وجہ سے ادھیڑ عمر کے لگ رہے تھے، دبلا پتلا، بیمار زدہ جسم، موٹی موٹی عینک، فائلوں کے انبار، کھوکھلی کھانسیاں، بلغمی تھوک، سگریٹ کا دھواں، اس ماحول کی قدر مشترک تھی، میں نے اپنا پوسٹنگ آرڈر (POSTING ORDER) افسر انچارج کو تھمادیا، اس نے پہلے اپنی عینک اُتار کر قمیض کے دامن سے صاف کیا، اور پھر پوسٹنگ آرڈر کی تحریر غور سے پڑھنے کے بعد بولا۔

"پہلی سروس ہے۔ یا اس سے پہلے بھی کر چکے ہو"۔ اس کی آواز سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اختلاج قلب کا پرانا مریض ہے۔

"جی ہاں۔ یہ میری پہلی نوکری ہے"۔

"خیر۔ خیر۔ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اس بات کا خیال رہے کہ یہ یونی ورسٹی پلے گراؤنڈ نہیں ہے۔ جہاں تم اسپورٹ مین اسپرٹ سے داد وصول کر سکو، یہ سرکاری دفتر ہے اور دفتر کے کچھ اصول اور قوانین ہوتے ہیں، جن کی پابندی ہر حال میں تم پر لازم ہوگی۔ وقت پر آؤ۔ اپنی میز کا پورا کام ختم کر ڈالو، جانے کا سلسلہ تم پر چھوڑ دیا جائے گا، لیٹ بیٹھ کر کام کرنا EFFICIENCY میں شمار کیا جاتا ہے، ترقی اور سالانہ انکریمنٹ کا انحصار ان ہی باتوں پر ہوتا ہے سمجھ گئے نا؟"

بات کرتے کرتے اس کا سارا چہرہ یکبارگی سرخ ہو گیا جسم کا بچا کھچا خون سمٹ کر اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں کے حلقے اور بیٹھے ہوئے رخساروں کو لگ گیا تھا، اس کی آنکھوں میں شاید ایک معمولی لمحے کے لئے ترحم کے جذبات آئے تھے۔ پھر وہی کرختگی اور سنگ دلی چھا جانے لگی۔ جو برسوں کی کڑی ریاضت میں اسے حاصل ہوا تھا۔ میں کچھ سمجھا نہیں، اپنے صحت مند جسم کے ساتھ باہر کی جو تازہ ہوا، پھولوں کی خوشبو، اور سورج کی روشنی لیکر آیا تھا انہیں اندر لانے کی سختی سے ممانعت کر دی گئی تھی۔

"میری باتوں کو سمجھ گئے"۔ اس کی آواز میں تحکم اور گرج تھی۔

میں جو کچھ دیر کے لئے گم ہو گیا تھا۔ ہڑبڑا کر بولا۔ "جی ہاں۔ جی ہاں بالکل"۔

میری سعادت مندی اور "یس مین" والے جواب سے شاید اسے بڑی تسکین حاصل ہوئی تھی۔ اس نے فخر سے ایک بار پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ آنکھوں آنکھوں میں اپنے ماتحتوں سے کہا میرے رعب کا عالم دیکھا، اور پھر اپنے چشمہ کو دامن سے صاف کرتے ہوئے کھنکارا۔ جاؤ وہ تیسری میز تمہاری ہے، کام سنبھال لو"

میں نے محسوس کیا کہ دفتر کے دوسرے ساتھیوں نے مجھے ذہنی طور سے قبول نہیں کیا میرا صحت مند جسم، چہرے اور آنکھوں کی تازگی، بازوؤں کی مچھلیاں، رفتار کی شوخی اور بے باکی ہمارے اور ان کے درمیان حائل تھی،

جب میں اپنی میز پر پہنچا تو عقب سے ایک مدھم گھسی پٹی آواز آئی۔

"نوجوان تمہارا خون ابھی تک ابل رہا ہے۔" ایک ہفتے میں سارے کس بل نکل جائیں گے"

میری بائیں جانب ایک لمبی سی کھڑکی تھی، جو تقریباً چار یا پانچ ہاتھ اونچی تھی۔ اس کے دونوں پٹ بند تھے، کمرے میں سخت گھٹن اور بوسیدہ فائلوں کی مکروہ بدبو پھیلی تھی۔ درمیان میں صرف ایک پنکھا تھا جو گھرر — گھرر — گھوں — گھوں — کی آواز کے ساتھ بڑی دھیمی اور بیمار رفتار سے چل رہا تھا۔

پتا نہیں یہ اس کھڑکی کو کیوں نہیں کھولتے، اگر کھڑکی کھل جاتی تو شاید اندر اس قدر اندھیرا اور گھٹن نہ ہوتی۔ میرا خیال ہے شاید وہ کھڑکی کھولنا بھول گئے ہیں۔ میں نے سامنے قریب بیٹھے ہوئے بابو پر نظر ڈالی۔ وہ ابھی نوجوان تھا مگر چہرے کی بے شمار جھریاں بگڑی چال اور آنکھوں کی پیلی پیلی رنگت سے وہ کہیں زیادہ عمر رسیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بال گھنگھریالے تھے۔ ناخنوں میں سیاہ میل جما ہوا تھا، اور وہ بار بار ڈرافٹ پیپر پر قلم سے آڑی ترچھی لکیریں کاٹ رہا تھا۔

مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا — "ابھی نہیں اور مستقبل قریب میں بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا۔"

"میں تمہارے اس جملے سے محظوظ نہیں ہوا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عورت انسان کی پہلی اور آخری ضرورت ہے۔ اور تم اس دفتر میں رہ کر ہمیشہ اس سے محروم رہوگے۔" پھر اس نے تیزی سے ڈرافٹ پیپر پر ایک ننگی عورت کی تصویر بنا کر مجھے دکھائی۔ "کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔" میں نے شرافت سے جواب دیا۔

"رکھ لو۔ تمہارے کام آئے گی۔" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے لاتعلق ہو گیا۔ اور کسی فائل پر نوٹ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ بات چیت اس سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ میں اس سے مایوس ہو کر دوبارہ کھڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ میں اس تاریک گھٹن میں سانس لیتا۔ میں نے اپنی کرسی پر کھڑے ہو کر کھڑکی کے ایک پٹ کو زور لگا کر کھول دیا۔ تازہ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ہی سورج کی دھوپ نے اندر کی گہری تاریکی کو جگمگا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کمرے کے اندر گھٹی گھٹی چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو کلرک انچارج سمیت تمام کلرک آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ رہے تھے۔ "کھڑکی بند کرو۔ کھڑکی بند کرو خبیث — کیا ہماری آنکھیں پھوڑو گے۔"

میں نے ترنت کھڑکی بند کر دی۔ کھڑکی بند ہوتے ہی دیکھا کہ پہلے سے زیادہ تاریکی کمرے پر مسلط ہو چکی تھی۔ آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوئیں تو ایک دم سے سبھی مجھ پر برس پڑے۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی کھڑکی کھولنے کی۔ دیکھتے نہیں روشنی سے آنکھیں چبھنے لگتی ہیں۔ اگر تمہیں تازہ ہوا اور روشنی کا اتنا خیال ہے تو چھٹی کے بعد جتنی چاہے حاصل کر لیا کرو۔ لیکن آئندہ سے کبھی یہ کھڑکی نہ کھولنا۔"

میرے پاس والے بابو نے میز سے پیپر ویٹ اٹھا لیا تھا۔ "اگر ابھی دوبارہ حرکت کی تو سر پھاڑ دوں گا۔ آئندہ احتیاط رکھنا۔"

تیسرے بابو نے کھانس کر کہا — "میاں ہمیں روشنی نہیں چاہئے۔ ہمیں اس کمرے میں تازہ ہوا نہیں چاہئے، روشنی میں آنکھیں چبھنے لگتی ہیں۔ اور تازہ ہوا سے سانس پھولنے لگتی ہے۔ ہم تو اس تاریک کمرے کے عادی ہیں۔ تم ہمیں اسی حال میں رہنے دو۔ ورنہ بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔ سمجھے۔"

"جی ہاں — جی ہاں۔ بالکل سمجھ گیا کہ تازہ ہوا اور سورج کی روشنی آپ کی آنکھوں اور پھیپھڑوں کے لئے مضر ہیں۔ میں آئندہ سے اس بات کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔"

میں بڑی دیر تک حیرت کی تصویر بنا تکتا رہا۔ دفتر کا تاریک کمرہ، بوسیدہ فائلوں کے انبار، گرد اور تھکن کی موٹی موٹی لحاف اوڑھے ہوئے پھیکے بے جان اور باسی چہروں پر زندگی کی علامات تلاش کرتا رہا مگر کمرہ بے حد تاریک تھا اور تاریکی میں کسی چیز کو ڈھونڈ لینا آسان کام بھی نہیں ہوتا۔ میں نے بند کھڑکی کی جانب دیکھا جس سے باہر کی زندگی، حیات بخش دھوپ کی حرارت اور روشنی اندر گھسنے کا راستہ ٹٹول رہی تھی۔

روشنی کی چمک، اور دھوپ کی حرارت اور چڑیوں کا شور — اُف باہر کی زندگی کس قدر حسین اور صحت مند ہے۔ میں ایک بھرپور انگڑائی لے کر کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

سوچنا تو چاہئے

بگڑ رہی ہے بات بات سوچنا تو چاہئے
ہوئے وہ کیا تعلقات سوچنا تو چاہئے

سبھی عنائتیں بجا سبھی نوازشیں بجا
مگر ہے تلخ کیوں حیات سوچنا تو چاہئے

ہمارے دن کی شورشیں ڈراؤنی ہیں کس لئے
بھیانک اتنی کیوں ہے رات، سوچنا تو چاہئے

نظر نظر مباحثے نفس نفس مذاکرے
بڑھی ہے کیوں ذرا سی بات سوچنا تو چاہئے

تمہاری آرزوؤں کا کہاں تک احترام ہو
ہماری بھی ہیں خواہشات سوچنا تو چاہئے

زرحت کنجاہی

○

ذہن بیدار ہیں اور لوح و قلم جاگے ہیں
دل سب اک ساتھ دھڑکتے ہیں کہ ہم جاگے ہیں

رنگ بنکر رُخ ہستی پہ بکھر جائیں گے
درد جتنے بھی تہ تیغ ستم جاگے ہیں

شور گلیوں سے اُٹھا اور گھروں تک پہنچا
در و دیوار بھی کہتے ہیں کہ ہم جاگے ہیں

اب تو کچھ دور نہیں منزل ارباب وفا
اب جنوں تیز ہے اب نقش قدم جاگے ہیں

اک نئے موسم کی سوچ کی بشارت لیکر
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم جاگے ہیں

اور کچھ اور فزوں تر ہو یہ احساس کی لہر
دل میں سوئے ہوئے جذبات الم جاگے ہیں

تیری نیندیں بھی اُڑیں اب مری نیندوں کی طرح
اب ترے دل میں بھی الطاف و کرم جاگے ہیں

کتنے ہنگامے اٹھے ہیں سر میخانۂ شوق
مدتوں بعد یہ پیرانِ حرم جاگے ہیں

کجکلاہانِ زمانہ کوئی تدبیر کرو
تیشۂ وقت سے پتھر کے صنم جاگے ہیں

روح احساس بھی جاگی کہ ترے ہجر نصیب
رات بھر صبح تمنا کی قسم جاگے ہیں

طے کر دو مرحلۂ گیسوئے دوراں نقوی
پیچ در پیچ کسی زلف کے خم جاگے ہیں

اصغر مہدی نقوی

ممتاز حسین

کچھ غالب کی زبانی کچھ اپنی غلط بیانی

تراچنانکہ توئی ہر نظر کجا بیند بقدرِ دانش خود ہر کسے کند ادراک

سیت یہ شعر معلوم نہیں کس عالم میں گنگنا رہا تھا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ مع اپنے کلاہِ پاپاخ اور فرغل کے تشریف لائے وضع قطع دیکھکر مسکرانے کو جی چاہا چونکہ صورت جانی پہچانی تھی اس لئے سپٹپا سا گیا۔ پھر بھی جرات وہمت سے کام لیا اور پوچھا حضرت کیسے تشریف لائے۔ فرمایا سنا ہے تونے بھی مثل اوروں کے میرے منتخب کلام میں قطع و برید کی ہے گویا میرے خون جگر کی از سرِ نو کشید کی ہے اور اپنے ایک معمولی سے دیباچے کے ساتھ فروخت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ میں اسے حد درجہ بے ادبی سمجھتا ہوں، کیونکہ تو اس کام کا اہل نہیں ہے اور جو اہل تھے انہوں نے میرے ساتھ کیا انصاف برتا جو تو اپنی نااہلی سے برتے گا، پھر تجھے آتا ہی کیا ہے یہی کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرلیتا ہے۔ حقیقت کو قابل ادراک سمجھتا ہے اور زندگی کے آہنگ کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ تیرے اس دورِ حاضر کے دماغ سے میری آشفتہ سری کیونکر میل کھائے گی۔ خیر ایک ہی بات سے تسلی ہے کہ تو بھی آزاد خیال ہے، تیرا بھی کیش، رسوم وملت کی زنجیروں کو توڑنے، جسم وجاں کو پیوند کرنے اور دست و ساغر کو باہم سینے کا ہے شاید اسی نسبت سے کچھ میرے دل کی باتیں کہہ جائے، جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ کچھ نرم پڑ رہے ہیں تو عرض کیا کہ آپ کی ساری باتیں درست ہیں لیکن چونکہ ہر نئی نسل اپنے آباو اجداد اور بزرگوں کے کارناموں سے از سرِ نو تعارف حاصل کرتی ہے جو کہ دورِ قدیم کے تعارف سے مختلف ہوتا ہے اس سلسلے میں میں نے بھی یہ جرأت کی ہے کہ آپ کا تعارف از سرِ نو دورِ حاضر کی نسل سے کراؤں۔ اور تعارف وہی اچھا ہوتا ہے جو نئی نسل کو آگے بڑھنے میں مدد کرے۔ "مردہ پرور دن مبارک کار نیست" یہ بات آپ ہی نے تو سر سید کو بھائی تھی اور پلٹنے نانک کے روبرو یہ شعر پڑھا تھا ؂

پا من میادیز اے پدر فرزندِ آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

ایسی صورت میں اگر کچھ میری باتیں بھی آپ کے خلاف طبیعت پڑیں تو امید ہے کہ آپ اپنی روشن خیالی کو راہ دیں گے۔ لیکن میں اپنی رائے کو کسی بھی معاملے میں اس وقت تک دخل نہ دوں گا جب تک میں آپ کی زبانی آپکے تمام حالات زندگی کو سن نہ لوں اور آپ کے نقطۂ نظر کو سمجھ نہ لوں۔ غالب نے یہ سُنکر تھوڑی دیر توقف کیا پھر بولے اچھا سنو ؂

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی بستر گانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فنِ آبائے ما کشاورزیست مرزبان زادۂ سمرقندیم

میرا دادا قوقان خاں بیگ اپنے باپ سے ناراض ہوکر محمد شاہ کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آیا۔ پہلے لاہور میں نواب معین الملک بہادر کی سرکار میں رہا جب نواب کا انتقال ہوگیا تو وہ دلی چلا آیا، اور شاہ عالم ثانی کی سرکار میں پچاس سوار اور طبل و علم کے ساتھ ملازم ہوا ایک سیر حاصل پرگنہ پہاسو رسالے کی تنخواہ کے لئے پایا۔ دادا کے انتقال کے بعد طوائف الملوکی کا جو ہنگامہ گرم ہوا۔ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا (مرزا عبداللہ بیگ خاں) لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چندے حیدرآباد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا کئی برس وہاں رہا، وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا، راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا (۱۸۰۲ء)

میری والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا وہ اکبرآباد کے مشہور ومعروف رئیس غلام حسین کمیدان کی چہیتی بیٹی تھیں۔ ساری عمر باپ ہی کے مکان پر رہیں۔ میں اسی گھر میں ۱۷۹۷ء، ۲۷ دسمبر کو پیدا ہوا۔ میری ایک بہن "چھوٹی خانم" مجھ سے عمر میں بڑی تھیں۔ میرا ایک بھائی مرزا یوسف بیگ خاں مجھ سے دو سال عمر میں چھوٹا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ہم لوگوں کی سرپرستی عم محترم نصراللہ بیگ خاں نے سنبھال لی جو کہ لارڈ لیک کے ایک دستے کے رسالدار تھے۔ چچا کی شادی نواب احمد بخش خاں والی لوہارو کی ہمشیرہ سے

ہوئی تھی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ تھی۔ میں ابھی نو برس کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ چچا باغیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ (۱۸۰۶ء) ان کے انتقال کے بعد ان کا رسالہ توڑ دیا گیا اور وہ مواضعات واپس لے لئے گئے جو کہ رسالے کی پرداخت کے لئے انگریزی حکومت سے ملے تھے، لیکن بطور پنشن پسماندگان کے لئے یہ طے پایا کہ نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارو اپنی جاگیر سے دس ہزار روپیہ سالانہ ہم لوگوں کو دیا کریں گے۔ یہ تھی بنیاد اس مقدمے کی جسے میں ساری عمر لڑتا رہا مگر کامیاب نہ ہوا کیونکہ نواب احمد بخش نے ہم لوگوں کی صغر سنی سے فائدہ اٹھا کر ایک شقہ کی رو سے دس ہزار کے بجائے پانچ ہزار لکھوا لیا تھا جس کی ہم لوگوں کو خبر نہ تھی اور اس پانچ ہزار میں ایک اجنبی کو بھی شریک کر لیا تھا اس کی تفصیل یوں تھی۔

۱۔ خواجہ حاجی دو ہزار سالانہ ——

۲۔ میرزا نصر اللہ بیگ کی والدہ یعنی میری دادی اور ان کی تین لڑکیاں ڈیڑھ ہزار سالانہ

۳۔ میرزا اسد اللہ خاں اور میرزا یوسف خاں ڈیڑھ ہزار سالانہ

اب تم جو یہ پوچھو گے کہ یہ اجنبی خواجہ حاجی کہاں سے ٹپک پڑا سو اس کا قصہ سنو۔ اس کا باپ میرے دادا قوقان بیگ کا سائیس تھا جو اس کے ہمراہ سمرقند سے آیا تھا، یہاں آکر اس نے ترقی کی اور میرے بہنوئی میرزا اکبر بیگ (میرزا فرحت اللہ بیگ کے پردادا کے بھائی) کی بہن سے شادی کر لی تھی۔ اس رشتے کے علاوہ اس کا ہمارے خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بہرحال میں اپنے حصے کے اسی ساڑھے سات سو سالانہ پہ گزارا کرتا رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے نانا اور ماموں نے بھی والد کے انتقال کے بعد دو گاؤں ہم لوگوں کی پرداخت کے لئے دے رکھے تھے، لیکن وہ دونوں گاؤں چند ہی دنوں کے بعد جاتے رہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ میں نے عہد طفلی اور عنفوان شباب کا زمانہ تکلیف میں کاٹا۔ کیونکہ میرزا غلام حسین کمیدان جن کے گھر میں پیدا ہوا، اور پلا بڑھا اپنی ریاست میں راجاؤں کے ہم پلہ تھے۔ تیرہ برس کی عمر تک جب تک کہ میری شادی نہیں ہوئی تھی اور دلّی کو میرا زندان مقرر نہیں کیا گیا تھا، کون سا ایسا عیش اور کونسی ایسی راحت تھی جو مجھے نصیب نہ تھی۔

بہرحال آمدم برسر مطلب۔ اس وقت کا اکبر آباد جہاں کہ میں نے عہد طفلی اور عنفوان شباب کا زمانہ گزارا اور ابتدائی تعلیم حاصل کی، اردو زبان اور علوم مشرقیہ کا بہت بڑا مرکز تھا اس کی ایک جھلک میاں نظیر اکبر آبادی کے کلام میں مل سکتی ہے۔ یہ بات جو حالی نے "گلستان بےخزاں" میں لکھی ہے کہ میں نے نظیر اکبر آبادی سے تعلیم حاصل کی سو وہ صحیح نہیں ہے اور نہ یہی صحیح ہے کہ مجھے ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ میں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اکبر آباد کے مشہور عالم مولوی محمد معظم سے حاصل کی جو کہ بیدل، اسیر اور شوکت کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ تعلیم کے سلسلے میں ایک نام ملا عبد الصمد کا بھی آتا ہے جو ۱۸۱۱ء میں بغرض سیر و سیاحت ایران سے ہندوستان آیا اور اکبر آباد میں دو سال تک نانا کی حویلی میں مقیم رہا۔ چنانچہ جس وقت میں ۱۸۱۳ء میں دلّی آیا ہوں تو وہ میرے ساتھ تھا، میں نے وہیں سے اسے رخصت کیا اس میں شبہ نہیں کہ شاعری میں نہ تو میں مولوی معظم کا شاگرد ہوں اور نہ ملا عبد الصمد کا اور نہ کسی اور کا چنانچہ اسی چیز کو سامنے رکھ کر میں نے یہ لکھا کہ ملا عبد الصمد ایک فرضی نام ہے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ قدیم فارسی میں نے اسی ملا عبد الصمد سے سیکھی جو کہ مذہب اسلام قبول کرنے سے پہلے زرتشتی مذہب کا موبد رہ چکا تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے قدیم فارسی کی تعلیم دی بلکہ زرتشتیوں کے مذہب اور ایران کی تاریخ بھی بتائی۔ چنانچہ میں نے دساتیر کو ساری عمر حرز جاں بنائے رکھا۔ یہ اسی کا طفیل ہے کہ میں نے دستنبو قدیم فارسی کے طرز پر لکھی اور مہر نیمروز میں عربی الفاظ سے پرہیز کیا۔ ان ساری تعلیمات کا اتنا گہرا اثر میرے دل و دماغ پر مرتب ہوا کہ میں ایرانیوں کے فطرت پرست (رنگین) طرز حیات اور گبرو ترسا کی روایات کا دل و جان سے قائل ہو گیا ؎

ہر چہ از دستگہِ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم ہمہ از آں جملہ زبانم دادند

بھلا ایسا کیوں نہ ہوتا؟ میں نے ایام جوانی میں جو رنگ رلیاں منائیں شاہد و شراب اور شعر و نغمہ کی فضا میں جو دن رات کاٹے وہ سب یہی تقاضا کرتے کہ زندگی کی لذتوں کو آواز دوں ؎

دم عیش جز رقص بسمل نہ بود
بہ اندازۂ خواہش دل نہ بود

اور یہ بات تو تمہیں معلوم ہی ہوگی ایران کا قدیم مذہبی فلسفہ ہمہ اوست (PANTHEISM) کا تھا۔ خدا کو فطرت سے یا حق کو خلق سے علیحدہ تصور نہ کیا جاتا۔ تقریباً یہی نظریہ فیثاغورث سے پہلے یونانیوں کا بھی تھا اس فلسفے سے توحید مطلق کے فلسفے کا سخت مت بھید ہے۔ چنانچہ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ باوجود اس بات کے کہ میں کلمہ لا الہ پڑھنے والا، رسالت، معراج اور امامت کا دل و جان سے ماننے والا تھا، میں توحید مطلق کا نہیں بلکہ فلسفۂ وحدت الوجود (MONOISM) یا یونانی زبان میں (HYLOZOISM) کا قائل تھا۔ اس فلسفے کی تفصیل تمہیں آگے دوں گا۔ جبکہ فلسفے سے متعلق کچھ باتیں کروں گا۔ فی الحال تو یہی یاد رکھو ؎

رموز دیں نشناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی است

چونکہ میری یہ بھی فطرت مادرزاد تھی۔ علماء کی خشک مغزی سے میل نہ کھاتی۔ میں نے سمرقندی حنفی سنی مذہب کو ترک کر دیا اور عجم کی شیعیت کی طرف مائل ہو گیا۔ لیکن اپنی ذات کو جیسا کہ اہل تصوف کا پیشہ ہے، ہر قسم کے دینی اور ملی تعصب سے پاک رکھا۔ میری نظر میں ہندو، مسلم، عیسائی، زرتشتی، سنی، شیعہ سب برابر تھے۔

میرے اس بیان سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تصوف پیشہ تھا۔ میری دلچسپی تصوف سے نظریاتی تھی نہ کہ عملی۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اب اس طبیعت کا حال سنو۔ میں جوان ہوتے ہی "فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا اور اس کا جوان میں اوباشوں اور فرومایگوں کی ہم نشینی سے بھی پرہیز نہ کیا" اور یہ سلسلہ شادی کے بعد بھی بہت دنوں تک قائم رہا کیونکہ میری شادی بہت کم سنی میں ہوئی تھی۔ میں ابھی تیرہ سال کا تھا کہ ایک گیارہ سال کی لڑکی مسماۃ امراؤ بیگم نواب احمد بخش خاں کی بھتیجی میرے گلے ڈال دی گئی اور مجھے پا بجولاں شہر دلی میں مقید کیا گیا۔ لیکن میری آزاد رو فطرت نے اس قید و بند کو قبول نہ کیا۔ وہ ستم پیشہ ڈومنی جس کا میں نے مرثیہ لکھا ہے

'شرم و رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

دلی ہی کی رہنے والی تھی۔ لیکن دلی میں ایک وہی ستم پیشہ ڈومنی ہی تو نہ تھی۔ میرے خسر الٰہی بخش المتخلص بہ معروف دلی ہی میں رہتے تھے، ان کے توسط سے میری ملاقات مولوی فضل حق خیرآبادی سے ہوئی جو کہ ایک جید عالم تھے۔ ان کی صحبت نے میری طبیعت کو بہت کچھ لگام دی۔ میں جس وقت دلی میں آیا تو انگریزوں کا نظم و نسق وہاں قائم ہو چکا تھا۔ سکہ ہنوز شاہ اکبر ثانی ہی کے نام پر ڈھلتا۔ لیکن حکومت کمپنی کی چلتی جہاں پہلے طوائف الملوکی تھی اور آئے دن بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتی تھیں، اب قدرے امن و امان تھا، لیکن اس ایک لفظ سے تم اس زمانے کی تاریخ نہیں سمجھ سکتے ہو تاوقتیکہ میں کچھ تفصیل سے نہ بتاؤں۔ اٹھارویں صدی کے اختتام تک کمپنی صرف تجارت کرنے میں دلچسپی لیتی رہی ہے۔ ہمارے ملک کا سوتی اور ریشمی کپڑا اور کچھ خام اشیا سستے داموں پر خرید کر لے جاتی اور یورپ کے ملکوں میں فروخت کرتی۔ لیکن یہ صورت انیسویں صدی کے اوائل میں نہ رہی کیونکہ جب ہندوستان کی دولت سے وہاں اٹھارویں صدی کے اختتام پر صنعتی انقلاب آیا، اور بھاری کارخانے سوتی کپڑوں کے کھلے جس میں مشین اور بھاپ کی طاقت استعمال کی جاتی تو انگلستان نے گھریلو صنعت سے آگے بڑھ کر مشینی صنعت کے دور میں قدم رکھا۔ اس نئے طریق پیداوار نے وہاں کے تاجروں اور دوکانداروں کو صنعتی سرمایہ داروں میں تبدیل کر دیا۔ انگلستان کے سرمایہ داروں کا نقطۂ نظر اسی وقت سے ہندوستان کے بارے میں بدلنے لگا، اور وہ آہستہ آہستہ یہاں کے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے۔ تاکہ اسے اپنی مصنوعات کے لئے ایک بازار میں تبدیل کر سکیں۔ پہلے انگلستان، ہندوستانی پارچہ جات کو درآمد کرتا اب وہ انیسویں صدی کے اوائل میں بالخصوص ۱۸۱۳ء کے بعد سے اپنے پارچہ جات کو برآمد کرنے لگا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب آیا اس کی ترقی معکوس ہو گئی، وہ صنعتی انقلاب کی طرف بڑھنے کے بجائے خالصتاً زرعی ملک میں تبدیل ہو گیا۔ ہر چند مجھے اعداد و شمار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن صرف تمہاری اطلاع کے لئے یہ بتا رہا ہوں کہ ۱۸۱۳ء سے پہلے ہندوستان میں ولایتی کپڑے کی درآمد دس لاکھ گز سے بھی کم تھی، ان کے پاس تھا ہی کیا کہ وہ یہاں لاتے۔ لیکن ۱۸۱۴ء اور ۱۸۳۵ء کے درمیان ولایتی مال کے درآمد کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی کہ ۱۸۳۵ء میں ۵ کروڑ دس لاکھ گز سوتی کپڑا درآمد کیا گیا۔ اس سے اب تم یہ اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ امن و امان جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، سیاسی اور انتظامی تھا نہ کہ اقتصادی خوشحالی کا۔ اقتصادی اعتبار سے تو ہندوستان روز بروز نیچے گر رہا تھا، ہمارے وہ تمام بڑے بڑے شہر جو کسی وقت میں صنعتی پیداوار کے مرکز تھے اور دنیا میں اپنا مقابل نہ رکھتے، اب آہستہ آہستہ ویران ہونے لگے کیونکہ کمپنی سیاسی اقتدار حاصل کر کے یہاں کی اقتصادیات کو ولایت کی اقتصادیات کی پابند بنا چکی تھی، صناع اور دستکار روز بروز شہر چھوڑ کر دیہاتوں کی طرف مراجعت کر رہے تھے تاکہ کھیتی باڑی پر گزر اوقات کر سکیں اس سے ہندوستانی اقتصادیات اور معاشرت میں کاشتکاری کا مسئلہ بڑا پیچیدہ بن گیا تھا۔ قابل کاشت زمین پر اس قدر بوجھ پڑا کہ اس کی پیداوار گھٹ گئی اور کسان آہ و فریاد کرنے لگے چنانچہ بنگال اور بہار میں کسانوں کے درمیان انگریزوں کے خلاف کئی بغاوتیں ہوئیں، وہابی تحریک نے کسانوں کے درمیان جو انگریز دشمنی کا روپ دھارن کر لیا اس کا یہی سبب تھا لیکن چونکہ ایک احیائی آئیڈیولوجی سے نیک کام سرانجام پانے کا۔ تھا اس نے مجھے اس تحریک سے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی سچ تو یہ ہے کہ شعراء میں بجز خاں صاحب کے کوئی بھی اس تحریک سے متاثر نہ ہوا۔ بہرحال یہ دور ہندوستان کو ایک نئے طرز سے لوٹنے کا تھا۔ یہ تاجروں کی لوٹ اور غارت گری کا زمانہ نہ تھا بلکہ صنعتی سرمایہ داروں کے لوٹ کھسوٹ کا زمانہ تھا۔ ایک صنعتی ملک کو زرعی ملک میں تبدیل کرنے کا دور تھا یہ میں کچھ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں ۱۸۴۰ء میں ایک انصاف پسند انگریز مانٹ گمری مارٹن نے ولایت میں جو تقریر کی ہے اس کا

اقتباس ملاحظہ ہو: "میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ ہندوستان اتنا ہی صنعتی ہے جتنا کہ وہ زرعی ہے اور وہ لوگ جو اسے ایک خالصتاً زرعی ملک میں تبدیل کرنے پر آمادہ ہیں ہندوستان کو مہذب ممالک کی نگاہ سے گرانا چاہتے ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہندوستان کو کیوں انگلستان کا ایک زرعی چک بنایا جا رہا ہے۔ اگر ہم انصاف کو مدنظر رکھیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان ایک صنعتی ملک ہے، اس کی گوناگوں مصنوعات صدیوں سے مشہور رہیں، ان کا مقابلہ دنیا کے کسی بھی ملک کی صنعت نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کو ایک زرعی ملک میں تبدیل کرنا بہت بڑی ناانصافی ہے"۔ لیکن یہ ناانصافی ہو کر رہی کیونکہ اقتصادیات کے قوانین انسان کی نیت اور انصاف پروری کے جذبے سے آزاد ہو کر خارج میں وجود رکھتے ہیں۔ امپیریلزم، سرمایہ داری کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اور جب ہمارا ملک انگلستان کے ایک زرعی چک میں تبدیل ہو گیا تو وہ سارے کالونی آباد کرنے والے انگریز جو کہ ویسٹ انڈیز میں حبشی غلاموں سے اپنے باغات میں کام لیتے، ہندوستان چلے آئے اور یہاں چائے اور کافی کے باغات لگائے اور ہندوستانیوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے جیسا کہ وہ ویسٹ انڈیز میں حبشی غلاموں کے ساتھ روا رکھتے۔ آسام میں ان کے خلاف شورش کا یہی سبب تھا۔ لیکن یہ سب تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ اب اس کا دوسرا رُخ دیکھو۔ انگلستان کے صنعتی سرمایہ داروں کی وہی اقتصادی ضرورتیں جو کہ اس ملک کی صنعت کو تباہ کر کے اسے ایک زرعی ملک میں تبدیل کرنا چاہتی تھیں انھیں اس بات پر بھی مجبور کر رہی تھیں کہ وہ اپنی مصنوعات کی مستقل درآمد اور یہاں سے خام اشیا کی برآمد کے لئے یہاں کے نظم و نسق میں دلچسپی لیں، ایک مستحکم اور پائیدار حکومت قائم کریں۔ لارڈ ڈلہوزی کی الحاقی پالیسی جس نے خود مختار رجواڑوں کا صفایا کیا، اسی ضرورت کے تحت وجود میں آئی۔ اس سے ہندوستان میں ایک سیاسی اور انتظامی اتحاد پیدا ہوا جو کہ اٹھارویں صدی میں مفقود تھا۔ اور جب سیاسی اقدامات کیلئے انھیں اپنی فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانیاں بہم پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے ریل کی پٹریاں بچھائیں، ٹیلی گراف کے کھمبے گاڑے اور ڈاک کا انتظام درست کیا۔ ان ساری چیزوں سے بالواسطہ ہمیں فائدہ پہنچا۔ ساتھ ہی یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ انگلستان میں بھی اس وقت قدامت پسند اور روشن خیال دو جماعتیں تھیں۔ اگر قدامت پسند جماعت ہمیں ہر طور سے پسماندہ رکھنا چاہتی تھی تو روشن خیال جماعت جو کہ فرانسیسی انقلاب کے خیالات سے متاثر تھی ہماری فرسودہ معاشرت میں سماجی اصلاحات بھی کرنا چاہتی تھی۔ ہر چند انہوں نے زمینداروں کا ایک نیا طبقہ ہماری معاشرت میں کھڑا کیا جو کہ ان کی سرپرستی کے لئے ستون کا کام دیتا رہا۔ انھی نے ستی، اولاد کشی اور بردہ فروشی کی ایسی مکروہ رسموں کو منسوخ کیا۔ اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ بنگال کے بابوؤں (کلرکوں) میں انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے سے ایک نیا شعور پیدا ہو رہا ہے جو مغربی تہذیب کی حمایت میں مددگار ہو سکتا ہے تو انہوں نے پریس کی آزادی دی اور فارسی زبان کو ہٹا کر بنگلہ اور اردو کو سرکاری زبان بنایا۔ پریس کی آزادی اور انگریزی زبان کی تعلیم کا رواج اور پھر لیتھو پریس کی ایجاد۔ ان ساری چیزوں نے مل کر، ایک ایسی ذہنی فضا قائم کر دی جسے روشن خیالی کے زمانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مورخین نے سنہ ۱۸۲۳ء سے لیکر سنہ ۱۸۵۷ء کے زمانے کو جو روشن خیالی کا زمانہ بتایا ہے وہ صحیح ہے۔ اس زمانے میں کلکتہ، آگرہ، لکھنؤ، کانپور اور دہلی علم و ادب اور روشن خیالی کے اچھے خاصے مراکز تھے۔ حالی نے حکیم محمود خاں کے مرثیے میں دلی کے انھیں اچھے دنوں کو یاد کیا ہے۔ ادھر اکثر اہل قلم نے جو میری ذات سے متعلق کتابیں لکھی ہیں ان میں صرف حکیم محمود خاں، مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی فضل حق خیر آبادی اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ ہی کے اثرات کو میری ذہنی تربیت میں ڈھونڈا ہے اس میں شبہ نہیں ان میں سے ہر ایک علم دوست اور ادب نواز تھا اور ان کے مذاق سخن نے میرے کلام کو جلا کیا ہے، لیکن غالب نے اپنے خیال اور عقائد میں ان سے بہت ہی کم اکتساب کیا ہے۔ سنو غالب کی آزاد خیالی میں دہلی کالج کی پھیلائی ہوئی آزاد خیالی کو بالواسطہ زیادہ دخل رہا ہے۔ گو غالب دلی کالج کے اساتذہ میں سے نہ تھا۔ دلی کالج میں جو مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم دی جاتی اس کا بالواسطہ اثر سارے شہر پر پڑ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ بنگال کی روشن خیالی، راجہ رام موہن رائے کی تعلیمات بھی عام طور سے ہندوستانیوں کو متاثر کر رہی تھیں، غالب کا دماغ ایسی تحریک کا ایک جزو تھا۔ ہندوستان میں اس وقت دلی ایک ایسا مرکز بن گیا تھا جہاں مغربی اور مشرقی علوم کے دھارے آکر مل رہے تھے۔ اگر ایک طرف شاہ عبد العزیز اور سید احمد بریلوی حدیث و فقہ کی تنقیح پر لگے ہوئے تھے تو دوسری طرف دلی کالج کے سائنس اور ریاضیات کے اساتذہ نئے علوم کا انجکشن دے رہے تھے۔ بطلیموس کی ہیئت کوپرنیکس کے انکشافات کے سامنے بے معنی ہو چکی تھی۔ سرسید نے جو ایک رسالہ "در ابطال حرکت زمین" سنہ ۱۸۴۸ء میں شائع کیا تھا وہ اسی روشن خیالی کی مخالفت میں تھا۔ ان کے خیالات تو انگلستان جانے کے بعد بدلے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ نیم ملا ہی تھے۔

یہ جو مسلمانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انگریزی تعلیم سے بھاگتے تھے صحیح نہیں ہے، اس وقت کے مسلمان عیسائی مبلغین کا اس

پالیسی کے خلاف تھے کہ طلبہ کو مشنری اسکولوں میں جبری طور سے بائبل کی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ جب وہابی تحریک نے زور پکڑا تو انگریزوں کی ہر چیز سے مقاطعہ کرنے ہی کو مذہبی فریضہ تصور کیا جانے لگا۔ اس سے کچھ لوگ نسبتاً متاثر ہوئے تھے اور وہ انگریزی زبان سیکھنا پسند کرتے تھے۔ اس ایک رد کی بنیاد پر جس میں ملاؤں کی عصبیت زیادہ کام کر رہی تھی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بالعموم انگریزی تعلیم سے گریزاں تھے۔ اس کا قصہ ذرا مختلف ہے۔ انگریزوں کی پالیسی شروع زمانے سے بلکہ ۱۸۵۷ء تک یہ رہی ہے کہ ہندوؤں کو ابھارا جائے اور مسلمانوں کو دبایا جائے۔ چنانچہ اسی پالیسی پر گامزن ہوتے ہوئے وہ خود ہی مسلمان لڑکوں کو اسکولوں میں بہت کم داخل کرتے۔ اور جب وہابی تحریک کے بعد عیسائی مبلغین اور مولویوں کے درمیان مذہبی مباحثہ چھڑ گیا تو اس عصبیت نے اور بھی زور پکڑ لیا۔ لیکن ان کوتاہیوں کے باوجود اس زمانے کے تعلیم یافتہ مسلمان علم دوست اور باخبر تھے جیسا کہ انگریز مورخین بھی اعتراف کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو فلسفہ اور منطق جانتے ہیں وہ افلاطون اور ارسطو سے لیکر بو علی سینا تک کے خیالات پر محاکمہ کرتے۔ مجھے بھی معقولات سے کافی دلچسپی تھی۔ چنانچہ میں نے دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیا کہ "اگر آدمی بننا چاہتا ہے تو فلسفہ اور منطق پڑھ۔ فقہ اور حدیث پڑھ کر کیا کرے گا" چنانچہ میں ساری عمر معقولات ہی کا مطالعہ کرتا رہا۔ فقہ و حدیث اور مسائل دین و آئین سے علاقہ نہ رکھا۔ شیخ محمد اکرام آزاد کا ایسی جو اپنی کتابوں میں [illegible] ہیں ذکر مفکر، انہوں نے تو مجھے فلسفے سے ایسا خارج کیا ہے گویا میری شاعری میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ یہ سراسر ناانصافی ہے اگر کسی کو میری آزاد خیالی پسند نہیں ہے، اسے دہریت معلوم ہوتی ہے تو بہتر یہی ہے کہ مجھ پر قلم ہی نہ اٹھائے۔ یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ میرے خیالات پر پردہ ڈالے۔ کچھ ایسا ہی سلوک میرے ساتھ حالی نے بھی اپنی سلیم الطبعی اور مصلحت میں کیا ہے۔ وہ بھی میری آزاد خیالی کو میری ظرافت ٹھہراتے ہیں۔ یہ اچھی ستم ظریفی ہے۔ بہرحال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میری آزاد خیالی میرا تشکک زمانے کی عام روش سے ہٹ کر تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقے میں یہ آزاد خیالی بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان اپنے قدیم علوم سے بہ نسبت ہندوؤں کے بربنائے واقفیت زیادہ وابستہ تھے۔ اور یہ آزاد خیالی مغربی علوم کے ذریعے ہندوستان میں پیدا ہوئی تھی۔ سر سید کی جو خدمات تعلیم کے میدان میں ہیں وہ ۱۸۵۷ء کے زمانے کی ہیں جبکہ غالب زندہ نہ رہا۔ ورنہ میں تو اسی سید احمد کو جانتا ہوں جنہوں نے رسالۂ "راہِ سنت و ردِ بدعت" اور رسالہ "در ابطالِ حرکتِ زمین" لکھا ہے، ۱۸۴۸ء کی بات ہے جبکہ سید احمد نے ابوالفضل کی کتاب آئین اکبری کی تصحیح و اشاعت کا بیڑا اٹھایا تو مجھ سے اس بات کے متمنی ہوئے کہ میں اس پر ایک تقریظ لکھ دوں۔ علمی خدمات کے نقطۂ نظر سے ان کا یہ ایک مستحسن فعل تھا۔ لیکن میرا ردِ عمل ان کی اس کارگزاری سے متعلق کچھ اس قسم کا تھا گویا وہ آئینِ اکبری کو سامنے لاکر انگلستان کے آئین اور جمہوریت کو کم وقیع ثابت کرنا چاہتے ہیں جبکہ میں نے جو تقریظ ایک مثنوی کی شکل میں لکھی اس میں ان کی اس در پردہ کوشش کی مخالفت کی۔ سید احمد مجھ سے تقریباً دس سال تک خفا رہے اور اس تقریظ کو اپنی کتاب میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے اس مثنوی میں جن باتوں پر زور دیا ہے وہ یہ ہیں کہ انگلستان کا آئین مغلیہ دور کے مطلق العنان حکومت کے احکام و اوامر کے مجموعے سے بہتر ہے۔ انگلستان نے جو نئی چیزیں ایجاد کی ہیں اس سے ایک نئے آدم کے وجود میں آنے کی دلیل ملتی ہے۔ اس کی حکمرانی "آب و آتش، خاک، باد" ان چاروں عناصر پر ہے۔ سائنس اور حکمت سے روگردانی کر کے فقہ اور حدیث کی طرف جانا اور اس نئے آدم کے وجود سے انکار کرنا اور اپنے کو آبا و غیروں کا غلام بنائے رکھنے کے برابر ہے۔ اسی مفہوم کو "مردہ پروردن مبارک کار نیست" کہہ کر میں نے ظاہر کیا ہے۔ اب تم اس مثنوی کے چند اشعار سنو اور غالب کی دوراندیشی اور دقت شناسی کی داد دو۔

صاحبانِ انگلستان را نگر　　شیوه و انداز اینان را نگر
تا چه آئینها پدید آورده اند　　آنچه هرگز کس ندیده آورده اند
زین هنرمندان هنر بیشی گرفت　　سعی بر پیشینیان پیشی گرفت
حق این قوم است آئین داشتن　　کس نیارد ملک به زین داشتن
داد و دانش را بهم پیوسته اند　　هند را صد گونه آئین بسته اند
آتشی کز سنگ بیرون آورند　　این هنرمندان ز خس چون آورند
تا چه افسون خوانده اند اینان بر آب　　دود کشتی را همی راند در آب
گه دخان کشتی به جیحون می برد　　گه دخان گردون به هامون می برد
غلطک گردون بگرداند دخان　　نر گاو و اسپ را ماند دمان
از دخان زورق به رفتار آمده　　باد و موج این هر دو بیکار آمده
نغمه ها بی زخمه از ساز آورند　　حرف چون طائر به پرواز آورند
این نمی بینی که این دانا گروه　　در دو دم آرند حرف از صد کروه (میل)
می زنند آتش به باد اندر همی　　می درخشد باد چون اخگر همی
رو به لندن کاندران رخشنده باغ　　شهر روشن گشته در شب بی چراغ

مرده پروردن مبارک کار نیست　　خود بگو کان نیز جز گفتار نیست
غالب آئین خموشی دلکش است　　گرچه خوش گفتی نگفتن به خوش است

اب تم جو یہ کہو گے کہ میں نے تو صرف ان کے صنعتی انقلاب کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان کی لوٹ کھسوٹ اور غارت گری کی طرف دھیان نہیں دیا ہے تو اس کے بارے میں یہ سنو۔ جب ۱۸۵۷ء میں آزادی کی جنگ چھڑی، کالے گورے باہم دست و گریباں ہوئے تو میری بھی رگ حمیت کسی قدر جاگی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو بہ سبب تعلق قلعہ میری پنشن معطل کیوں جاتی۔ لیکن اس چیز کو میں نے ایسا چھپایا کہ اس پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اگر ایک طرف یہ گمان ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا سکّہ میں نے لکھا تو دوسری طرف میں نے اپنی مصیبتوں کے ردِ عمل میں قلعہ معلّٰی کو "قلعۂ نامبارک" بھی لکھا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ میرا مسلک انسان دوستی کا تھا۔ میں اس مستقبل کو تو دیکھ پایا تھا جبکہ انسان اپنے تمام تعصبات ذہنی اور ملی مٹا کر ایک انجمن میں تبدیل ہو جائے گا۔

بہ روزے کہ مردم شوند انجمن
شود تازہ پیوند جانہا بہ تن

لیکن اس منزل تک پہنچنے میں جنگ و جدال کے طریقِ کار کا قائل نہ تھا۔ اب مجھے تم خواہ ترقی پسند سمجھو یا رجعت پسند۔ سنو میری ایک رباعی اگر تم بالطبع ملا نہیں ہو۔

یارب بہ جہانیان دلِ خرم دہ
در دعویٰ جنت آشتی باہم دہ
شداد پسر نداشت باغش ارثست
آں مسکنِ آدم بہ بنیِ آدم دہ

خدا گواہ ہے میں نے فریزر کے قتل کے متعلق نواب شمس الدین کی چغلی نہیں کھائی یہ سراسر بہتان ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میری طبیعت میں جھنجھلاہٹ تھی اور میں مخالفت کی تاب ذرا کم ہی لاتا تھا پھر بھی اپنے پر قابو رکھتا، یاروں نے میری شاعری کا کیا کیا مذاق نہ اڑایا اگر میری طبیعت میں سلامت روی اور بردباری نہ ہوتی تو میں اپنی شاعری کی اصلاح کیوں کرتا۔ پچیس سال کی عمر تک کا سارا شعری سرمایہ رد کر دیا صرف چند ایک غزلیں رہنے دیں۔ رہ گئی یہ بات کہ میں دربار سے اکرام و انعام کی توقع زیادہ کیوں رکھتا، انگریز گورنروں کے قصائد کیوں لکھتا، خلعت اور جاہ و منصب کے لئے عرضیاں کیوں گزارتا، سو اس کا سبب میرا ماحول اور وہ طبقہ تھا جو ریاست کھو کر انگریزوں کا وظیفہ خوار بن چکا تھا۔ غالب کی سفلگی اسی طبقے کی سفلگی تھی خواہ اس باب میں تم میرے خطوط لاؤ یا قصائد۔ میں مرحوم جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتا، اسی کی وضع داریاں اور طرزِ رہائش محبوب تھی زمانے نے ہرچند سمجھایا کہ غالب کے پاس اب بجز شاعری کے اور کیا ہے لیکن میں اسے سمجھ نہ پایا کہ میں میرزا عبد اللہ کا بیٹا، میرزا نصر اللہ بیگ کا بھتیجا، میرزا غلام حسین کمیدان کا نواسا اور نواب الٰہی بخش والیٔ لوہارو کے بھائی کا داماد تھا پھر بھی جب کبھی کوئی ایسا وقت آیا ہے جبکہ عزت نفس اور ذریعۂ معاش کے درمیان جنگ ہوئی ہے تو میں نے عزت نفس ہی کا ساتھ دیا ہے ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

چنانچہ میں نے قصائد میں بھی اس بات کا خیال رکھا ہے کہ بات اس طرح کہوں کہ عرضِ مدعا کھل جائے اور میں سُبک بھی نہ ہو سکوں۔ لیکن اس وضعِ احتیاط کے باوجود جب میں اپنی زندگی کی سرگزشت پر کڑی نگاہ ڈالتا ہوں تو اسی نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ غالب تجھے جس قدر خود بین و خود آرا ہونا چاہئے تھا، جس حد تک تجھے عزت نفس کا خیال رکھنا چاہئے تھا اور جس حد تک صبر و رضا اور توکل کو راہ دینی چاہئے تھی اتنا تو نے نہیں کیا۔ مقدمے کی پیروی، پنشن کی بازیابی، خلعت کی تمنا اور روزی لقمے کے حصول میں تو نے کیا کیا نہ کیا ؎

سراز منت ناکساں زیرِ خاک
لب از خاکبوسِ کساں چاک چاک
بگیتی درم بے نوا داشتی
دلم را اسیرِ ہوا داشتی
بساں عمرِ ناخوش کہ من داشتم
ز جاں خار در پیرہن داشتم

اس آخری مصرعے پر غالب کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس خوف سے کہ کہیں وہ اپنی روحِ شکستہ کو لے کر جو کہ خار در پیرہن ہے پرواز کر جائیں اور میں سعادتِ دید سے محروم نہ رہ جاؤں، انھیں سہارا دیتے ہوئے کہا آپ کے جود و سخا کے ان ارمانوں کی بھی داد دینی چاہیے جو کہ ان اشعار میں ہیں ؎

نہ بخشندہ شاہی کہ بارم دہد
بہر بار زر پیل بارم دہد
کہ چوں پیل زاں جا برانگیزمے
زرش بر گدایان فرو ریزمے

یا پھر جو کہ اس خط میں ہے "قلندری و آزادگی، ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں ... نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔"

میرا خیال ہے کہ ایثار و کرم کی یہ آرزو آپ کی زندگی میں تشنۂ معنی نہ رہی جس شفقت اور مہربانی سے آپ نے یوسف کی خبر گیری کی، عارف کے بچوں کو پالا، پنشن بند ہونے کے بعد بھی نوکروں کو برطرف نہ کیا، وہ سب اس کی گواہی دیتے ہیں کہ غالب نے بقدرِ وسائل ان آرزوؤں کو عملی جامہ پہنایا۔ میرے اس جملے سے ان کی ہزیمت خوردگی کچھ دور ہوتی ہوئی نظر آئی تو میں نے ان کی توجہ ان کے کلام کی طرف موڑ دی۔ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ آپ غزل کے بارے میں تو یہ کہتے ہیں ؎

غزل گر ملال آرد افسانہ گوئی   کہن داستا نہائے شاہانہ گوئی

لیکن جب غزل کہتے ہیں تو اس میں زندگی کا نشاط اور تصور اتنا نہیں ابھرتا جتنا کہ افسردگی اور دل گرفتگی کا۔ اس افسردگی کا تعلق آپ کی نجی زندگی سے ہے یا اس میں زمانے کے دکھ درد سے یا دونوں ہی سے اس کا رشتہ ہے۔ غالب نے فدا سے توقعت کیا پھر بولے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مجھے سطوت دیرینہ کے اٹھنے کا کوئی احساس زیاں نہ تھا۔ موت خواہ طبعی ہی کیوں نہ ہو احساس زیاں کو نہیں کھوتی ہے۔ میری حالت کچھ ایسی ہی تھی سطوت دیرینہ کے اٹھنے کا غم تو نہ تھا لیکن احساس زیاں ضرور تھا۔ اداس وہ ناصحانہ انداز جو میری اس غزل میں آگیا ہے اسی کا عکس ہے ؎

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل	زنہار گر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو	میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی	مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط	دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ	یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

غزل کی زبان رمز و کنایہ کی ہوتی ہے، اس رمز و کنایہ میں اس کا یقین مشکل ہے کہ کہاں میری ذات ختم ہوتی ہے اور کہاں سے نفس غیر کی دنیا شروع ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ صحیح ہے کہ ابتدائی اشعار کا ناصحانہ انداز اس کی غمازی کرتا ہے کہ اس میں غالب سے زیادہ غالب کا ماحول ہے لیکن کون اسے بتا سکتا ہے کہ غالب نہیں ہے۔ بہرحال اسے یاد رکھو کہ فلسفیانہ اشعار کو چھوڑ کر میری غزلوں میں ایسا بہت کم ہے جہاں غالب کا اپنا ذاتی تجربہ نہ ہو۔ میں ہی اپنے اشعار کی دنیا کا مرکز ہوں۔ لیکن وہ میں" (Depersonalized) بھی ہے بغیر اس جوہر کے شاعری عالمگیر خصوصیت کی حامل نہیں ہوتی ہے۔ یہاں لفظ "بھی" اہم ہے، میں اپنی ذات سے بے تعلق ایک مخصوص حد ہی تک پیدا کر سکتا ہوں، رہ گئی یہ بات کہ افسردگی زیادہ ہے اور نشاط کم تو وہ اظہر من الشمس ہے، اس وقت تو ہر طبقے کی زندگی میں افسردگی زیادہ تھی اور نشاط بہت ہی کم۔ اور وہ نشاط جو کہ میرے حصے میں آیا۔ وہ تو درد تہ جام تھا۔ اب اسے تم تنگ نظری سمجھو یا انفرادیت یا کسی اور خطرناک لفظ سے یاد کرو، ہمارے وقت میں ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ شاعر اپنی ذات سے ہٹ کر بھی محسوس کرتا رہا ہو یا آخر آرٹ کی بنیاد محسوسات ہی پر تو ہے، یہ کیونکر ممکن ہے۔ رہ گئی شعور کی بات سو وہ اس وقت منظم نہ تھا، اس اندھیرے سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پھوٹی تھی میری نفسیاتی کشمکش میں اس قسم کا تصادم نہ تھا کہ اپنی

شخصیت مکمل کرنے کے لئے سماجی انقلاب کی ضرورت ہے وہ نفسیاتی تصادم تو صرف آنا تھا۔ اگر تم میں کے دامن کو وسیع کر سکو ؎

جہاں از گل و لالہ پُر بو و رنگ	من و چہرہ و دامنی زیر سنگ
دم عیش جز رقص بسمل نہ بود	بہ اندازۂ خواہش دل نہ بود

یا پھر ریختہ میں سنو۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور میں نے اس کشمکش میں خارجی طاقت کا ہاتھ تو دیکھا لیکن اس کی نشاندہی نہ کر سکا، کیونکہ میں سماجی تبدیلیوں کے قوانین سے واقف نہ تھا مجھے یہ تو معلوم تھا کہ زمانہ بدلتا رہتا ہے، اس کی رفتار کو لگام نہیں سلطنت کو قیام نہیں لیکن ان تبدیلیوں کا راز کیا ہے؟ اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اور اگر کچھ علم تھا تو وہی صوفیانہ ؎

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے   پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

اس فلسفے کو آگے سمجھاؤں گا فی الحال تو یہ کہنا ہے کہ جس قسم کا علم تمہیں کائنات کی حرکت کا ہے ویسا مجھے نہ تھا، کائنات کی ہر شئے کو متحرک میں اسی کی ذات میں سوچتا۔ اور چونکہ تخلیق عالم اور تخلیق انسان سب اسی کی اپنی خود نمائی کا نتیجہ ہے ع

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس لئے جو گرانی بھی مجھ پر گزرتی اس میں اسی کا ہاتھ دیکھتا ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک پسند نہ تھی
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

موسوی شریعت میں جو کہ غلامی کے عہد میں وجود میں آئی۔ انسان اور خدا کے رشتے، آقا اور بندے کے تھے۔ لیکن تصوف کے نزدیک یہ رشتہ عاشق اور معشوق کا رہا ہے جو کہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں چنانچہ اہل تصوف صرف نیاز ہی نہیں کرتے بلکہ اس سے ناز بھی اٹھواتے ہیں، ہم جو طنز کرتے ہیں اس کی ذات سے متعلق اس میں اسی رشتے کو سامنے رکھتے ہیں

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

چنانچہ میری شاعری میں زہد و اتقا، خوف عقبیٰ اور حور و قصور کا ذکر نہیں ہے، اس میں میرے ایمان اور عمل کے تضاد کو دخل نہیں ہے جیسا کہ بعض اہل شریعہ کا یوجہ سعادتمندی خیال ہے، جنید بغدادی بایزید بسطامی، منصور ان میں سے کوئی بھی سزا و جزا اور جنت و دوزخ کی تعبیر احوال سے کرتے نہ کہ مقامات سے۔ اس پر اضافہ کرو مجھ طبیعت کا جس سے متاثر ہو سنائی جیسا بزرگ کہتا ہے ؎

حرام کرد خدا بادہ را ، چو عرب … زخشک مغزی در بادہ بے ادب گشتند
عجم سزد کہ بنالد ز عرب کہ عجم … زخشک مغزی اعراب خشک لب گشتند

اسی مجہی طبیعت کا سہارا لیکر میں نے بھی کچھ اشعار کہے ہیں ؎

دراغ چیتہ مسکیں چہ داند ترا … بہ آرائشِ نامہ خواند ترا
(اثر مجھے)

رضا جوئے من شوکت ہو کشم … گرم نیل جیحون وہی درکشم

اور پھر اس انداز سے دوزخ اور جنت کو واپس کیا ہے ؎

چو آں نامرادی بیاد آورم … بفردوس ہم دل نیاسایدم
دلے را کہ کستہ نگلیسد بباغ … در آتش چہ سوزی بسوزندہ داغ
صبوحی خورم گر شراب طہور … کجا زہرۂ صبح وجام بلور
دراں پاک میخانہ بے خروش … چہ گنجائی شورشِ نائے نوش
سیہ مستی ابر و باراں کجا … خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ … غم ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت وہد ناشناسا نگار … چہ لذت وہد وصلِ بے انتظار
گریزد دم بوسہ ایمنش کجا … فریبد بہ سوگندِ دنیش کجا
نظربازی و ذوقِ دیدار کو … بفردوس روزن بدیوار کو
بہ ہر جرم کز روئے دفتر رسد … زمن حسرتے در برابر رسد
بفرمائی کایں داوری چوں بود … کہ از جرم من حسرت افزوں بود

یہاں غالب رند، پارسا "شاہد باز" اور نہ گبر مسلمان غرض سبھی کچھ ہے، نہیں بتا دیکیا یہ سب میں اس لئے کہتا کہ میں ایک ظریف حیوان تھا، جیسا کہ سعادت مند حالیؔ نے لکھا ہے یا اس لئے کہ مجھے وہ سودا پسند نہ تھا جس پر عرب تیار ہو گئے تھے ؎

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے … نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی … پاداشِ عمل کی طمع خام بہت ہے

سچ تو یہ ہے کہ معاد اس کا ہو جس کا مبدا ہو۔ ہم تو روز ازل سے اس کے ساتھ ہیں ع ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ؎

من ز تو کہ بدنام ہسیا تیم … رفتم ہائے منشور ریکتا تیم

فلسفۂ وحدت الوجود اسی کو کہتے ہیں۔ یہ کائنات ایک اکائی سے پھیلی ہے، نہ کہ عدم سے وجود میں آئی ہے۔ یہ کائنات اس کی ذات احدیت حقیقت کا خارجی اظہار ہے جیسا کہ جامیؔ نے لوائح میں لکھا ہے۔ صوفیوں نے یہ فلسفہ یونانیوں اور ایرانیوں سے مستعار لیا، گو ایسا نہیں ہے۔ کہ قرآن مجید سے اس کا استنباط نہ ہو سکے۔ اس لئے دونوں کے درمیان تقدم و تاخر بے معنی ہے لیکن چونکہ علماء سو محافظ قوانین حکمرانی اسکے خلاف تھے، کیونکہ اس میں حق و خلق کا رشتہ حاکم و محکوم، خالق و مخلوق آقا و بندے کا نہیں رہتا بلکہ انسان حیثیت خدا وندی میں شریک ہو جاتا ہے اور اس طرح شریعت کے بدلنے کا مستحق ہو جاتا ہے، اس لئے صوفیوں کو سولی پر کھینچا گیا اور ایک وقت ان پر ایسا آیا کہ اگر وہ خاموش نہ بیٹھتے تو ان کا صفایا ہو چکا ہوتا ؎

عارفاں کو جامِ حق نوشیدہ اند … راز ہا دانستہ و پوشیدہ اند (رومی)
ہر کرا اسرارِ حق آموختند … مہر کردند و دہانش دوختند

پھر بھی وہی رومیؔ یہ بات بھی کہہ گئے ؎

رندے دیں دریدہ می گفت دیہا باں … صوفی خدا نہ دارد او نیست آفریدہ

یہاں لفظ آفریدہ پر زور ہے نہ کہ خدا پر کیونکہ صوفی تو بغیر خدا کے رہ ہی نہیں سکتا ہے، بہرحال یہ جبر و تشدد کا ردِ عمل ہے جو کہ صوفیوں کے ساتھ روا رکھا گیا کہ منصور یا حسین فارسی کی شہادت کے بعد صوفیوں نے تصوف کو قرآن مجید اور احادیث کے رنگ میں رنگا اور اسے شریعت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی چنانچہ انہیں تاویلات کی بنا پر صوفیوں کے درمیان مختلف مکاتیب اور نظام قائم ہوئے، اس کام کو سر انجام دینے میں قشیری (رسالہ) مکی (قوت القلوب) الکلابازی (تعارف) ابونصر سراج، ہجویری اور غزالی کی اہم خدمات ہیں ہمہ اوست کی جگہ ہمہ از دوست، وحدت الوجود کی جگہ وحدت الشہود اور اسی قسم کی دوسری اختراعات کی گئیں اور جب اس سے بھی حق اور خلق کے درمیان انفصال قائم نہ ہو سکا تو حق کو موجود اور خلق کو لا موجود ٹھہرایا گیا حق کو آفتاب اور خلق کو عکسِ آفتاب یعنی حق کو حقیقی اور خلق کو غیر حقیقی ٹھہرایا گیا۔

شیخ فریدالدین عطار فرماتے ہیں ؎

عرشِ عالم جز طلسمے بیش نیست … اوست بس ایں جملہ بیش نیست
غیر تو ہر چہ ہست سرابِ نمائش است … کایں خانہ اندک است نہ بسیار آمدہ
اینجا حلول کفر بود اتحاد ہم … کایں وحدتے است لیک بتکرار آمدہ

یہ فلسفہ بھی کوئی نیا نہ تھا، یونانیوں اور ہندوؤں کے درمیان قدیم سے رائج تھا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیا عدم محض سے کوئی شے وجود میں آ سکتی ہے کہ نہیں۔ وحدت الوجودیوں کا خیال ہے کہ نہیں۔ اس لئے وہ مانند یونانیوں کے مادے کو بھی اتنا ہی قدیم تصور کرتے ہیں جتنا کہ حق کو چنانچہ علماء سو اسے مادیین کا فلسفہ بتلاتے اس لئے وحدت الوجودیوں کے دو بنیادی مکاتیب بن گئے، ایک وہ جو حق کے ساتھ خلق کو بھی حقیقی جانتا اور ہیولے (غیر متشکل مادہ) کو ابدی بتاتے اور دوسرا وہ جو حق کو حقیقی اور خلق کو غیر حقیقی جانتا۔ گو دونوں ہی اس بات پر متفق ہیں کہ حق خلق کے ساتھ ملحق ہے، متحد ہے، ورنہ بصورت دیگر جیسا کہ علماء سو کا تصور ہے شرکِ خفی کا پایا جانا لازمی ہے کیونکہ کوئی شے عدم محض سے وجود میں نہیں آ سکتی ہے۔ بہرحال دونوں مکاتیب

میں سے آخرالذکر کا تصادم علماء سو سے نسبتاً کم رہا کیونکہ خلق کو شے حقیقی بلا کر وہ تشبیہ کو کم در کرتے اور تنزیہ پر زور دیتے یعنی انا الحق کو کمزور کرتے اور ہوالحق پر زور دیتے اور اس طرح علماء سو کے تراشے ہوئے اعتراض "شرک جلی" کا جواب دیتے اور انھیں مطمئن کرتے ۔ غالب جو کہ کلمہ لاالہٰ کا پڑھنے والا اور باطن میں لاموجود الا اللہ کو ماننا آخرالذکر تاویل وحدت الوجود ہی کو صحیح مانتا ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

یا پھر یونان کے سوفسطائیوں کا ہم خیال ہو کر یہ کہتا جس کی تائید سبزوریؔ مغنوں نے بھی کی ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

لیکن غالب چونکہ شاعر بھی تھا، اس کے مشاہدے میں عالم حلقۂ دامِ خیال نظر نہ آتا، اس لئے اس نے اپنے اس فلسفے پر اظہار شک بھی کیا ہے اور بصورت استفہام عالم کے اثبات کا ادعا بھی کیا ہے

لاموجود الا اللہ

جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی صورت تغیر پذیر ہے۔ لیکن اس سے ان کا وجود غیر حقیقی نہیں ہو جاتا ہے۔ اگر نمود صور (یعنی تشکل نمود صور بر وجود بحر) نہ ہو تو ہمیں وجود کا علم نہیں ہو سکتا ہے، نمود صور حق کا ایک تخلیقی طریق کار ہے جس کو کوئی ثبات نہیں۔ بقول فلوطینس جس کو غالب نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اور اس کا وہ آئینۂ عالم ہے جس کا وہ عین ہے، اس عین عالم کو ہم اس کے عالم میں جان سکتے ہیں جو کہ خارج سے ہمیں نہیں آیا ہے بلکہ اس کا ایک خارجی اظہار ہے اگر عین، عالم کی داخلی حقیقت ہے تو عالم، عین کا خارجی اظہار ہے اسی چیز کو سامنے رکھ کر میں نے یہ شعر کہا ہے

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

بقول ورڈزورتھ کے جس کی شاعری سے میں واقف نہ تھا "ایک ہی اسپرٹ ہے جو کہ سارے عالم کے قلب و جگر میں غلطاں و پیچاں ہے" ہے

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

بلاؤ علماء سو کو ان سے پوچھو کہ کہاں سے اس فلسفے میں شرک جلی ہے، ہمہ اوست پتھر کنکر نہیں ہے بلکہ ان کی حقیقت باطنی ہے جو کہ یہ ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

شرک تو وہاں ثابت ہوتا ہے جبکہ علماء سو حق اور خلق کو جدا جدا تصور کرتے ہیں گویا دو حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور جب اس دوئی سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایک کو عدم محض سے وجود میں لاتے ہیں جو کہ محال ہے "لاموجود الا اللہ" والے صوفیوں نے اگر ایک طرف اسی دوئی سے بچنے کے لئے توحید مطلق کو چھوڑ کر توحید وجودی کو اپنایا تو دوسری طرف مادے کی قدامت سے روگردانی کرتے ہوئے جو کہ یونانیوں کا فلسفہ تھا اور کن فیکون سے کسی قدر مت بعید رکھا۔ یونان کے قدیم فلسفۂ توحید وجودی کو (PARMENIDES) اور سوفسطائیوں کی اس ترمیم و اصل کے ساتھ قبول کر لیا کہ حق حقیقی اور خلق اعتباری ہے لیکن اسے کوئی سمجھانے والا نہ رہا کہ اعتباری کے معنی (RELATIVE) اضافی کے ہیں نہ کہ بے حقیقی یا سائے کے۔ گمراہی نے قدم پکڑا اس دنیا کو وہمی اور خیالی تصور کیا جانے لگا۔ غالب بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہا ہے۔ مجھے اپنی اس شکست کا اعتراف ہے، میرا فلسفۂ وحدت الوجود دورِ انحطاط کی تاریکیوں سے آمیز رہا ہے۔ گو ایسا نہیں ہے کہ بہت سے اور امور میں میں نے صوفیاء کبار کی لے میں اپنی لے نہ ملائی ہو، مذاہب کی تنگ نظری انسانیت کی تفریق کے خلاف آواز نہ اٹھائی ہو، زندگی کی کامرانیوں کو لبیک نہ کہا ہو، شوق فضول اور جرأت رندانہ کو آواز نہ دی ہو اور پھر یہ کہا ہو

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

اور نہ ایسا ہی ہے کہ فلسفۂ وحدت الوجود جو کہ عالم کے حق میں تغیر اور اضافیت لایا۔ اس سے میں بے خبر رہا ہوں۔ لیکن اب اسے کیا کرو گے کہ ایک زوال آمادہ سوسائٹی کے رجحان سے متاثر ہو کر میں فلسفۂ اضافیت یا فلسفۂ تغیر میں زوال (CHAOS) پر زیادہ زور دیتا رہا اور اس کی آفرینش پر اتنا زور نہ دے سکا جتنا کہ چاہئے تھا

ہے زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

بہرحال اسے اچھی طرح گرہ کر لو کہ یہاں "زوال آمادہ" کے معنی فنا ہونے کے نہیں ہیں۔ میں فلسفۂ تغیر کی دائمیت یا فلسفۂ فنا کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو کہ یونان میں موجود تھا نہ کہ مولویوں کے فلسفۂ فنا کی طرف جس کے عالم کالعدم ہو جائے گا۔ اگر عالم کا مقدر کالعدم ہونا ہوتا تو وہ بجائے گراں نمود صور کیوں اختیار کرتا اور وہ شاہد حقیقی اپنا ہی مشہود کیوں بنتا؟ اب تم جو یہ کہو گے کہ میرا یہ نقطۂ نظر قدامت پسند (CONSERVATIVE) دنیا تو سی سے تو تمہیں جتا دوں کہ ارسطو کے نظریات کم دنیا تو تھے جنہوں نے دنیا میں دو ہزار سال

تنگ جگرانی کی۔ گو یہ صحیح ہے کہ میرے زمانے میں یورپ کے مفکرین نے ارسطو، بطلیوس، اقلیدس کی باتیں الٹ دی تھیں، اور اس کے بعد بھی انہوں نے ترقی کی۔ لیکن اس کا علم مجھ تک کہاں پہنچا تھا میرے کچھ احباب انگریز یقیناً تھے، ان سے ولایت کے ایجادات پر تبادلۂ خیال ہوتا، کچھ دہلی کالج کے اساتذہ سے سُنا، کچھ کلکتے میں دیکھا بھالا اس سے ذہن میں چمک یقیناً پیدا ہوئی، لیکن مغربی علوم سے واقفیت پیدا نہ کر سکا۔ یہ غالب کے بس میں تھا۔ میں تو صرف قدامت کے دریچے سے نئے زمانے کو دیکھ رہا تھا۔ قدامت سے نکلنے کیلئے ایک نئے منظر کی ضرورت تھی جسے میں بتا نہ سکا۔ پھر یہ کہ میں اپنے ذاتی معاملات اور مصائب میں اس قدر مبتلا رہا کہ اس کا مجھے دماغ بھی نہ تھا پنشن کا مقدمہ سولہ سال تک ۱۸۲۶ء سے ۱۸۴۲ء تک مسلسل چلتا رہا، ہزاروں کا مقروض ہو گیا، قرضخواہوں نے ڈگری کرائی، گھر سے نکلنا بند کر دیا جوسر کھیلنے کی لت تو تھی ہی جب تک مرزا خانی کوتوال شہر رہا غالب کا گھر اچھا خاصہ قمارخانہ تھا۔ بدقسمتی سے جو یادری کی فیض الحسن خان نئے کوتوال شہر بنے انہوں نے مجھے قمارخانہ قائم کرنے کے جرم میں ماخوذ کیا اور چھ ماہ کے لے جیل بھیج دیا جہاں سے تین ماہ کے بعد رہا ہو کر آیا لیکن اس سے کیا اشک شوئی ہوتی، داغِ رسوائی برقرار رہا۔ معاش اگرچہ قلیل تھا۔ لیکن انگریزی سرکار میں عزت زیادہ پاتا تھا۔ گورنمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے جیغہ، سرپیچ مالائے مروارید خلعت مقرر تھی*۔ اس حسب نسب اور اس عزت وقار کے ہوتے ہوئے غالب کو ایک اخلاقی جرم میں ماخوذ ہو کر جیل میں جانا کیوں کر نہ شاق گزرتا۔ اس بے عزتی کا داغ میرے دل سے کبھی نہ مٹا اسی زمانے میں میری مالی حالت اس قدر سقیم ہو چکی تھی کہ اگر میں دسمبر ۱۸۴۹ء بہادر شاہ ظفر کا ملازم نہ ہو جاتا اور تاریخ لکھنے کے کام پر مامور نہ کیا جاتا تو جینا دوبھر ہو جاتا۔ لیکن تنخواہ ملنے کا وہاں عجب ہنجار تھا۔ سال میں صرف دوبار ششماہی تنخواہ ملا کرتی، چنانچہ ایک عرضی نظم کی جس سے مشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار ماہ بماہ ملنے لگا سہ

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

اس سے کسی قدر اشک شوئی تو ہوئی، لیکن فارغ البالی کہاں نصیب ہوتی مجھے ۱۸۵۴ء میں مرزا فخرو ولی عہد سلطنت میرے شاگرد ہو گئے اور استاد ذوق کے بعد بادشاہ نے بھی اپنے کلام پر اصلاح لینی شروع کی تو کشادگیٔ رزق پیدا ہوئی۔ لیکن زمانہ تاک میں تھا، ابھی دو تین سال بھی چین سے گزرنے پائے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر رونما ہوا گھر کا جو کچھ اثاثہ تھا وہ لٹا، انگریزی پنشن بند، قلعے کی تنخواہ ختم۔ ان دنوں غالب کیونکر جیا یہ کسی معجزے سے کم نہیں ہے، جب ہنگامہ فرو ہوا اور شہر میں آبادکاری شروع ہوئی تو میں نے بھی پنشن کی بحالی اور سرکار میں اپنی صفائی کے لئے تگ و دو شروع کی۔ اس تگ و دو میں تقریباً تین سال کا زمانہ گزر گیا۔ یہ تین سال میں نے کیسے کاٹے ہیں کچھ نہ پوچھو۔ چنانچہ میں نے اسی پریشان حالی کے زمانے میں کبھی پٹیالہ کا قصد کیا تو کبھی نواب رامپور کے دربار سے سلسلہ جنبانی کی۔ لیکن شراب اس زمانے میں بھی نہ چھٹی خدا بھلا کرے ہرگوپال تفتہ اور مہیش پرشاد کا جو مہیا کرتے رہے جب تین سال کے بعد پنشن بحال ہوئی اور نواب صاحب رامپور کے دربار میں بھی باریابی ہوئی۔ تو ایک بار پھر اطمینان نصیب ہوا۔ لیکن اس زمانے میں اس قدر کمزور اور ضعیف ہو چلا تھا کہ امراض نے حملہ کر دیا، اور یہ سلسلہ نو سال تک قائم رہا۔ جبکہ میں گور میں نہ پہنچ گیا۔ اپنی موت سے سال بھر پہلے میں نے جو یہ ایک خط میں لکھا ہے۔ "آگے ناتواں تھا اب نیم جاں ہوں، آگے بہرا تھا اب اندھا ہوں، رعشہ، ضعف بصر، جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حروف سوجھنے سے رہ گئے" حرف بہ حرف صحیح ہے، غذا اس قدر کم ہو گئی کہ کچھ نہ کھانے کے برابر تھا، صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب، چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر" اس پر اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہ سکتا اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اٹھتا تو پنڈلیاں لرزتیں، تمہارا غالب اسی عالم میں بہتر سال کی عمر میں خاک سے جا ملا۔

اب انصاف کرو یہ زندگی تمہیں کہیں سے ہموار نظر آتی ہے زیادہ سے زیادہ تم میرے اسیر ہوس ہونے پر اعتراض کر سکتے ہو لیکن اس وقت تمہیں مجھے اپنے ماحول میں دیکھنا ہوگا۔ جب نازونعم اور امارت اور ریاست کے ساتھ جوانی کے دن کاٹے اس کے مدمقابل تکالیف کے دن اور بھی زیادہ بوجھل ہو گئے۔ اس پر میرے فن کی ناقدری، خود پسندی کا یہ عالم کہ بڑے سے بڑا شاعر نظر میں نہ سماتا۔ خودداری کا یہ عالم کہ "الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا" وضع داری اس بلا کی کہ جو ہوتا آ پاتا اسی میں تاکدم زیست فرق نہ آیا۔ طبیعت ایسی کہ موٹا جھوٹا پسند نہیں ساری بلاؤں کے پس منظر میں اگر غم نہیں تو اور کیا تھا جو میرے سینے میں جگہ بناتا۔ وہ سارا حزن و یاس، افسردگی اور اضمحلال جو کہ تم میرے اکثر اشعار میں پاتے ہو انہیں ناساعد حالات کا نتیجہ ہے۔ کبھی دل دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا۔ تو کبھی بے مہری ابنائے وطن سے رنجیدہ ہوا۔ کبھی نا کسوں کی خوشامد سے آزردہ تو کبھی اہل کرم کی نامہربانیوں سے آشفتہ رہ گیا

بزمِ عشق سو وہ میرے ساتھ اتنا جاں گسل تھا، لیکن وہ اک لذتِ غم
جس سے خونِ جگر میں سرخی تھی، اس کی کیابی اور کم ذوقی کا غم یقیناً تھا۔ ؎

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

اور جب یہ روزِ سیاہ پہنچا تو تخیل ہی کے سہارے زندہ رہنے کو غنیمت جانا

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور ؎
دل میں نظر آتی ہے تو اک بوند لہو کی

میرے خطوں میں آخر رکھا ہی کیا ہے یہی کچھ ہوا و ہوس، لذتِ کام و دہن،
جنتِ نگاہ فردوسِ گوش اور آرزوہائے جان و دل کی باتیں ہیں کبھی
صبرِ گریز پا کا شکوہ تو کبھی رنجِ گراں نشیں کی شکایت یا پھر کبھی تصورِ گزر
تصورِ جمال کا ذکر، میری شاعری میں سیاستِ دوراں کا ذکر ہو تو ہو
سیاستِ تخت و تاج کا زیادہ ذکر نہیں ہے۔ اپنی زندگی تو بیشتر
بارگاہِ حسن میں سجدہ ہی کرتے گزری۔ اس پر تمناؤں کا وہ ہجوم کہ جب
انہیں دل میں جگہ نہ ملی تو جگر میں در آئیں جب اپنا یہ عالم دیکھا کہ مجھ
پر ہمیشہ قیامت ہی گزرتی رہتی۔ ایک اُن کے آنے سے پہلے اور ایک
ان کے جانے کے بعد تو یہ دستور نکالا کہ غالب اپنی ذات سے بے تعلق
برت۔ کچھ طنز و مزاح کی باتیں کر کے دل کو ہلکا کر، کچھ اپنے پہ ہنس
اور کچھ دوسروں کا مذاق اڑا۔ کہ اس سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے
اور وہ استغنا پیدا ہوتا ہے جس سے آدمی سب کچھ جھیل جاتا ہے"

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

تو جو کہ آدمی آدمی کو طبقات میں بانٹتا پھرتا ہے اس نکتے کو کیا جانے کہ
میں نے اپنی شاعری میں انسان کے عنصری جذبات رقم کئے ہیں۔ میں
نے کہا بجا ارشاد ہے ذرا پھر تو کہئے۔ فرمایا میں یہ تو مانتا ہوں کہ ادنیٰ و
اعلیٰ حاکم و محکوم، غریب و امیر کی نفسیات کسی قدر اعتبارِ پیشہ، رشتۂ
پیداوار اور املاک جدا جدا ہو جاتی ہے، اور اس اعتبار سے میری
نفسیات بھی طبقۂ امراء کی تھی، لیکن چونکہ میں پنشن خوار تھا کسی علاقے
اور تعلقے کا مالک نہ تھا۔ ایک ادنیٰ آدمی کی طرح حصولِ رزق میں
جان کھپاتا رہا اس لئے میرے قلب و جگر میں وہ ساری دردمندی تھی
جو ادنیٰ طبقے کے آدمی کے ساتھ بھی ہمدردی کا اظہار کر سکے
ہر ایک شاعر اپنے اپنے انداز میں آدمی کو انسان بنانے کی فکر میں رہتا ہے
چونکہ دورِ حاضر کے تقاضوں سے واقف نہ تھا اور نہ اسے پسند ہی کرتا۔
اس لئے مجاہدۂ نفس پر زور دیا ہے۔ ایک شاعر کو نسبتاً اس سے
ہم سروکار رہتا ہے کہ انسان میں سفلہ پن کی خارجی رشتوں کی

مسلسل زور آزمائی سے پیدا ہوتا ہے وہ تو یہ کہتا ہے کہ وہ سفلہ ہے
چنانچہ میں نے ساری عمر آدمی کے قلب و جگر میں اسی لئے نقب لگائی تاکہ
اس کی ریاکاری کو بے نقاب کر سکوں۔ میں نے انسانی جذبات کے ان ابدی
سرچشموں پر انگلی رکھی ہے جو کہ چھپا ہیں۔

ان گنت سوسائٹیوں کے تغیرات پر، میں خواہشات کو انسانی محرکات
اور ترغیبات کا بنیادی سرچشمہ سمجھتا ہوں۔ اگر ایک طرف اس سرچشمے
کو بند کرنے کی کوشش نفیِ حیات کے مترادف ہے جیسا کہ فلسفۂ رہبانیت
میں ہے تو دوسری طرف اس کو بے لگام چھوڑنے میں بھی چنگیزی کا خطرہ ہے
میرے نزدیک اس کا حل (HUMANIZED PAGANISM) یعنی
انسان نواز فطرت پرستی ہے فطرت پر انسانی قوانینِ فطرت کے مطابق
ہی کیا جا سکتا ہے نہ کہ خلافِ قوانینِ فطرت جن لوگوں نے اس نکتے کو بھلایا
وہ نہ صرف مادہ پرستی کے شکار ہو گئے بلکہ انہوں نے فطرت سے اپنے
رشتۂ وحدت کو بھی توڑ لیا جس نے یہ کائنات اپنی ذات (ESSENCE)
میں ایک ہے اور اپنی صفات (ATTRIBUTES) میں کثرت پذیر ہے
عارف وہ ہے جو مستِ ذات ہو ؎

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا	ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات	عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے	آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن	چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

چنانچہ اگر ہمیں قرونِ وسطیٰ کے فلسفیانہ مکاتیب میں رکھا جائے تو ہم
ذات پرست ہیں نہ کہ صفات پرست اور اسی نقطۂ نظر نے ہمیں تجربیت
سے دور رکھا جس کا تم آج رونا روتے ہو گو ہم افلاطون کے اس نقطۂ نظر
کو نہیں مانتے ہیں کہ تو نہ صرف اپنے منفرد (EMPERICAL
KNOWLEDGE) سے آزاد و خارج میں وجود رکھتا ہے۔ بہر حال زندگی
کے اس سفر میں جو کہ سو فیصدی معقول نہیں ہے شکستِ شیشۂ دل
کی بھی ایک قیمت ہے اور حسن و عشق کی آویزش کا بھی ایک مقصد ہے جس
کی پیروی غالب کے ہی قلم سے کچھ اچھی ہوئی ہے ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے	کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

میں نے پوچھا آخر اس شعر کا یہاں کیا موقع تھا فرمایا میری شاعری میں
اندازِ بیان کو ایک خاص جگہ حاصل ہے جس پہ مجھے اپنے تمام دعووں میں
زیادہ افتخار ہے میں نے دیکھا کہ ان کے اس جملے پر ان کی نگاہ واقعی کچھ بھیگ گئی
ان کے اس موڈ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔ ایک جگہ تو آپ یہ
کہتے ہیں ؎

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی　　تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

اور دوسری جگہ یہ کہتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے　　جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

اب آپ ہی بتائیے ان دونوں بیانات میں کس کو صحیح مانا جائے۔ کہنے لگے بات یہ ہے کہ میں پچیس سال کی عمر تک بیدلؔ، صائبؔ، ظہوریؔ، شوکتؔ اور اسیرؔ وغیرہ کی طرز میں غزلیں لکھتا جو کہ بظاہر اردو میں ہیں لیکن بباطن فارسی ہیں جہاں تک معانی اور مطالب کا تعلق ہے ان میں مضمون آفرینی اور حسن تعلیل کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اور بعض جگہوں میں تو میری یہ کوشش اس قدر حرف مطلب سے دور جا پڑی ہے کہ اگر میں خود مطلب سمجھانے پر آؤں تو ناکام رہوں گا۔ میرے اس طرزِ سخن کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے مجھے مہمل گو کا خطاب دیا۔ لیکن چونکہ اس وقت تک مجھے اپنی بے راہ روی کا مکمل احساس نہ تھا۔ اس لئے میں نے "تماشائے نیرنگِ صورت" والا شعر جل کر کہا تھا۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ مجھے ساری عمر اسی بات کا غرہ رہا کہ میرا کلام معنی و مطالب کے جواہر سے مالا مال ہے۔ اس پر میں نے جسارت کرتے ہوئے کہا لیکن آپ کا یہ دعویٰ کمزور معلوم ہوتا ہے آپ نے اپنے خیالات کو بار بار دہرایا ہے گویا ایک ہی خیال کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈتے رہے ہیں یہ الفاظ دیگر آپ کی نظر معنی و مطالب سے زیادہ اظہار پر رہی ہے اور اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آپ کے ایک فارسی خط سے اقتباس پیش کروں۔ آپ لکھتے ہیں کہ "ذوقِ سخن کہ ازلی آوردہ رہزنی کردہ مرا بدان فریفت کہ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن نیز کار نمایاں است" پھر کلیاتِ فارسی کے دیباچے میں آپ نے اپنی شعرگوئی کا جو یہ مسلک ٹھہرایا ہے ؎

نہ چنانم کہ بہ عقیدۂ خویش　　از فسوں کسے ہراس کنم
نتوانم کہ از نصیحت و وعظ　　عالمے را خداشناس کنم

اس کا منطقی تقاضا یہی ہے کہ آپ صورتِ معنی ہی پر زور دیں۔ یہ سنکر غالبؔ قدرے برہم ہو گئے اور کہا تم شعر و سخن سے متعلق میرے نقطۂ نظر اور خیالات کو سمجھنے سے قاصر رہے ہو۔

سنو میں حرف ہو کا قائل تھا اور خداشناسی کے باب میں اپنی ذات ہی کو پہچاننے کو معرفت کا زینہ سمجھتا اور عام صوفیاء کی طرح چشم باطن کے ادراک کو راہ نہ دیتا بلکہ عقل ہی کو رہبر اور ہادی بناتا جو تخلیق اول ہے اس وجہ سے مجھے اس قسم کی شاعری پسند نہ تھی جیسی کہ سعدیؔ عطارؔ اور سنائیؔ نے کی ہے اور جس میں عقل کو حقیقت کی جستجو میں معذور ٹھہرایا گیا ہے ؎

نہ از من ز سعدی شنو تا چہ گفت　　سخن گفت و بیہودہ اما چہ گفت

ز عقل جز ہیچ در ہیچ نیست　　بر عارفاں جز خدا ہیچ نیست
دگر رہروے گوید از زیر دلق　　کہ حق است محسوس و معقول خلق
خیالے در اندیشہ دارد نمود　　جہاں غیب غیبت بجز شہود
نشاہائے راز خیالِ خودیم　　نواہائے سازِ خیالِ خودیم
خوشتا باد غالبؔ بہ راز آمدن　　نواسنج قانونِ راز آمدن
تصوف نہ زیبد سخن پیشہ را　　سخن پیشہ کن ز اندیشہ را
غزل گر بنا شد نوائے دگر　　سرِ دل سلامت ہوائے دگر
زشاہاں سخن گر بہ سفتن　　سخن گفتن از حق جگر سفتن
زنالی زغم گر جگر سفتہ شد　　سخنہائے حق ہیں کہ چوں گفتہ شد
خود این نامہ فہرست راز حق است　　درون و برونش طراز حق است
ز انگیز معنی و پرداز حرف　　بہ ہنگامہ ہستی طلسمے شگرف
سخن چوں ز ہمدم بہ پیغام نیست　　مرا زو پہ یرفتنش چارہ نیست

اب شاید تم اس بات کو سمجھ سکو کہ میری شاعری کا موضوع کیا تھا۔ میری شاعری کا محبوب ترین موضوع اپنی ذات تھی جو کہ معرفتِ حق کا آئینہ ہے اور اپنی ذات کو سمجھنے کے لئے عقل درکار ہے نہ کہ چشمِ باطن چنانچہ پند و نصائح اور فلسفہ بازی سے میں نے اسی لئے احتراز کیا ہے اور اپنے نفس کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اگر تم بجائے پھر کم فلسفے کی لغت کو معنی و مطالب سمجھتے ہو تو بے شک وہ چیز میرے یہاں نہیں ہے اس پر میں نے دریافت کیا پھر یہ تعلی کیوں ہے ؟ یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ کہنے لگے بس یونہی رو میں آ کر کہا ورنہ بقول حزیں سچ تو یہ ہے ؎

شہما بردہ ام از صدق بخاک شہدا　　تا دل و دیدہ خونابہ فشانم دادند

اور جس کا اعتراف نثر میں یوں کیا ہے "شاہم از آزادی کہ بسخن بہ ہنجار عشقبازاں گزاردستم و دائم از آزمندی کہ در تیچے چند بہ کردار دنیا طلباں در مدحِ اہل جاہ سیہ کردستم"۔ میرا جو کارنامہ گنجینۂ معنی سے ایک طلسم شگرف پیدا کرنے کا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ میں نے اپنی نفسیات کے تجزیے سے ایک آئینہ تیار کیا ہے جسے بدست اہل عقل اس لئے دیا ہے کہ وہ اس آئینے میں اپنی صورت دیکھیں اور حقیقت کو پہچانیں۔ میں حقیقت نگاری کا قائل تھا نہ کہ معرفت نگاری کا "آئینہ زدودن" کا فقرہ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ میں صورتِ معنی کو بھی چمکانے کا قائل تھا سو اس سے انکار نہیں۔

جہاں تک ابتدائی دور کے کلام کا تعلق ہے وہ سب کا سب کم مایہ ہے کیا بہ اعتبار معنی و مطالب اور کیا بہ اعتبار صورت وہ سب میری موزونیٔ طبع کی کارستانی تھی، اس میں میرا کوئی اندرونی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ یہ احساس مجھ میں اس وقت تک

پیدا نہ ہوا جبتک کہ زمانے سے میرا سابقہ پڑا۔ بزرگوں کی صحبت اور جادۂ خیال سے شاعری کی خوبی اور اس کے مقتضیات کو پہچانا نہیں عرفی اور نظیری کی طرف مائل نہ ہو، اس وقت اسد اللہ خاں مرگیا اور غالب نے جنم لیا۔ جب میں اپنی اس تبدیلی پر سوچتا ہوں تو بجز اس کے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ غالب شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوا تھا، ایک شاعر کا دماغ رکھتا تھا۔ لیکن شاعر کے دل سے کچھ دنوں تک محروم رہا۔

پچیس سال کی عمر تک دیدہ و دل خوں فشانی میں کوتاہی برتتے رہے۔ بعد میں اس خوں فشانی کا سامان غمِ زیست اور غمِ عشق دونوں ہی نے بہم پہنچایا ؎

من از خویشتن با دلِ دردمند — دائے غزلِ برکشیدہ بلند
کسے را کہ با غم سشماری بود — روا داشت در غمگساری بود
کہ در خستگی چارہ جوئی کند — بہ غم خواری افسانہ گوئی کند
خود از درد بیتاب خود چارہ جوئی — خود آشفتہ مغز و خود افسانہ گوئی
بہ تنہائی از ہجر جانانِ خودم — بہ دل مردگی نوحہ خوانِ خودم
کسم در سخن کار فرمائی نیست — بہ بخشندگی ہمت افزائی نیست
در آں گنج تار و شب ہولناک — چراغ طلب کردم از جان پاک
نیزد ان غم آمد دل افروزِ من — چراغ شب و اختر روز من
فشاندہ من شکوہ سنج زغم — خرد رنجہ از من چوں رنجم زغم

اس پر میں نے ان کی توجہ اس شعر کی طرف بھی دلائی ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

کہنے لگے یہ بات اس وقت کی ہے جبکہ غالب جوان تھا۔ جب ان کے اس جواب سے میری تسلی نہ ہوئی تو میں نے پھر صراحتاً پوچھا تو پھر آپ یہ کیوں کہتے ہیں ؎

نہ دانی کہ مینا شکستن بہ سنگ — نہ بخشد بہ دل ذوقِ قلقلِ چنگ

اس پر وہ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بولے "میں نے مثنوی ابر گہر بار میں زیادہ تر اپنی خواہشات کا ذکر کیا ہے۔ فطرتاً مجھے قلقلِ چنگ ہی پسند ہے لیکن اگر وہ میسر نہ ہو تو کیا میں اپنے دل کو ایک ساز غم میں نہ بدلوں پھر یہ کہ غم صرف رونے دھونے اور آہ و فریاد ہی کی چیز نہیں ہے بلکہ تجسس بے چینی اور اضطراب کا بھی ایک مشغلہ ہے۔ وہ انسان ہی کیا جسے کوئی غم نہ ہو اور یہ غم آزادوں کو ایک نفس سے بیش نہیں ہوا کرتا، اس کا کام صرف جھیز کو ہے مع انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں۔ راحت کا تصور بغیر غم کے محال ہے ؎

گل کردن صد رنگ بہار از جگر خاک — برجستن یکدستہ شرارہ از رگِ خارا

چنانچہ میری شاعری میں دل و جگر کے الفاظ بجز اس کے کوئی معنی نہیں رکھتے کہ میں ان کی مدد سے دل گداختہ یا سینۂ آذر فشاں کی طرف اشارہ کر سکوں ؎

گریہ را از دل نشاط دیگر است — خندہ بر لبہائے خنداں میزنم

لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے کہ میں شعر و شاعری کا محرک تنہا غم ہی کے جذبے کو سمجھتا ہوں، اس میں خرد اور شعور کو بھی دخل ہے۔ اگرچہ یہ منظر جذبۂ حیرت سے آزاد نہیں ہے ؎

غمانم کہ پیوند حرف از کجاست — دریں پردہ لحنے خنگرف از کجاست
گر از دل شناسم جنوں پیشہ نیست — کہ آں نیز یک قطرہ خوں بیش نیست
خرد را سگالم کہ نیرو دہد — خرد او را زمن حیرتی رو دہد

لیکن میں نے اس حیرت کے پردے کو بھی چاک کیا ہے ؎

دل و دست باہم دگر دوختہ — دریں کیسہ گرد آمدہ اندوختہ
روان و خرد باہم آمیختہ — ازیں پردہ گفتار انگیختہ

سخن گرچہ پیغام راز آورد — سرود از چہ اہتزاز آورد
خرد داند ایں گوہری در کشاد — زمغز سخن گنج گوہر کشاد
خرد داند آں پردہ بر ساز بست — بہ رامش طلبے ز آواز بست
بہ دانش توان داشت پاس دم داشتن — شمارِ خرام قلم داشتن

جب میں نے ان کی زبان سے اقلیم خرد کی کارستانی کا یہ حال سنا اور اس سے واقف ہوا کہ وہ یونانیوں کے مانند خرد ہی (نفس ناطقہ) کو تخلیق اول سمجھتے ہیں تو میں نے ان سے استفسار کیا "اچھا یہ بتائیے اگر آپ شعر و نغمہ کا خرد سے ہم آہنگ ہونا اس قدر ضروری سمجھتے ہیں تو پھر آپ نے یہ شعر کیوں کہا ؎

اے ذوقِ نواسنجی بازم بخروش آور — غوغائے شبیخونی بر بنگہ ہوش آور

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آپ افلاطون کے اس نظریے سے قریب ہو گئے ہیں کہ شاعری کے لئے بے خبری اور مدہوشی ضروری ہے۔" اس کے جواب میں فرمایا تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ عالم بے خبری اور مستی میں خرد رہنما نہیں رہتی ہے ؎

بہ مستی خرد رہنمائے خود است — نہ دیگر زخود ہم بجائے خود است

میں اس مستی کا قائل تھا لیکن اس سے یہ معنی نہیں نکلتے ہیں کہ میں الہامی شاعری کا قائل تھا۔ وہ جو بجنوری مرحوم خدا انہیں غریق رحمت کرے جوش عقیدت میں لکھ گیا ہے کہ غالب کا کلام ایک الہامی کتاب ہے، سخت تمسخر سا ایک ہے میرے کلام کو الہام سے کیا نسبت۔ میں نے اپنے اشعار میں جس قدر قطع و برید کی ہے، جس طرح ایک ایک لفظ کو بار بار تولا ہے، مصرعے کے مصرعے اشعار کے اشعار خارج کئے ہیں وہ سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ میرے یہاں یہ کلام خالصتاً عرق ریزی اور جوش زنی کا رہا ہے۔ فکر کے موقع پر ہجوم الفاظ کو چھنتا تھا نہیں و من از خم

پر اس طرح رکھنا جس طرح نگینہ انگوٹھی میں رکھا جاتا ہے، انتہا سے زیادہ ہنرمندی کا کام ہے جس کے لئے ایک مناسبت طبعی بھی درکار ہے۔ اوائے خاص اسی مناسبت طبعی کا نام ہے۔ کبھی وہ بات ایک ہلکے سے طنز سے بن جاتی ہے، کبھی مزاح سے تو کبھی تکلف سے عاری ہوتے ہیں۔ میرے ان اشعار میں کیا دھرا ہے بجز طرز ادا کے پھر بھی لوگ پڑھا کرتے ہیں سہ

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

یہ جو بظاہر ایک بے تکلفی کا انداز ہے اس میں میری شخصیت کی خراش و تراش اور نفاست طبع کو بھی دخل تھا۔ کچھ لوگوں کو کلچر وراثت میں ملتا ہے اور کچھ لوگوں کو اکتساب کرنا پڑتا ہے۔ غالب اس معاملے میں خوش نصیب تھا کہ اسے کلچر وراثت میں ملا تھا۔ یوں تو یاں ہر شخص چٹپٹے اور گرم و سرد کھٹے اور میٹھے کا احساس رکھتا ہے لیکن ان الفاظ میں اس کی تعریف کس نے کی ہے، "صاف شستہ، گوارا، زود ہضم، سریع النفوذ" اور جس حد تک میرا یہ کلچر روسا کے طبقے کا تھا جس میں ایرانی النسل اور تورانی النسل منصب داروں کی اکثریت تھی میں گاؤں گرام کے کلچر اور عوامی بولیوں کے ادب یعنی دوہے اور گیت سے بالکل ہی بے نیاز رہا اور یہ تعصب اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ برج اور اودھی کے شعرا کو تو چھوڑو، ہندی نژاد فارسی گوؤں کو بھی خاطر میں نہ لاتا۔

اب تم جو یہ پوچھو گے کہ میں کس حد تک ہندوستانی تھا تو اس کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ باوجود اس بات کے میں اپنے آپ کو تورانی النسل کہا کرتا لیکن اپنا مولد ہندوستان ہی کو جانتا۔ اور ہندوستان ہی کو اپنا وطن جانتا۔ جیل جانے کے بعد جب ذلت و رسوائی نے بیزار کیا تو ایک دفعہ تارک الوطن ہونے کا قصد کیا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد اس خیال سے باز آیا۔ یوں تو میں نے تعریف کلکتہ اور بنارس کی بھی کی ہے۔ لیکن وہ سب کی سب از قبیل حسن پرستی ہے۔ اصل لگاؤ مجھے دلی ہی سے تھا۔ اس کی گلیاں تادم آخر یاد رہیں۔ اس زمانے کی حب الوطنی اور اس زمانے کی حب الوطنی میں بڑا فرق ہے۔ آج حب الوطنی ملکی ہوتی ہے جسے تم نیشنلزم کہتے ہو۔ اس زمانے میں حب الوطنی مقامی یا شہری ہوتی تھی۔ مجھ میں وہی مقامی حب الوطنی تھی جو میرے جذبۂ انسانیت کے عالمگیر پہلو سے ہم آہنگ تھی۔ مجھ میں انگریزوں کے خلاف کوئی نفرت کا جذبہ نہ تھا اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ دولت انگلشیہ کے ساتھ میرے خاندان کی خدمات وابستہ تھیں اور ہم سب انھیں خدمات کے پنشن خوار تھے اور چونکہ ستارۂ اقبال مندی انھیں کا روشن تھا اور وہی میری مشکل کشائی کر سکتے تھے اس لئے میں نے ان کی مدح گستری سے بھی پرہیز نہ کیا، مشکل ہی سے کوئی ایسا گورنر ہوگا جس کا کہ میں نے قصیدہ نہ لکھا ہو۔ میں نے دربار انگلشیہ میں درباری شاعر یا ملکہ وکٹوریہ کے کوئی پوئٹ بننے کی بھی درخواست بھیجی تھی لیکن چونکہ میرے معاملات بغاوت کے واقعات سے الجھ گئے اس لئے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بغاوت کے دنوں کا معاملہ یہ ہے کہ میں سنہ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ ظفر کا وظیفہ خوار بنا اس سے پہلے میرا تعلق "قلعہ نامبارک" سے برائے نام تھا یعنی یہی عید بقرعید کے موقع پر کوئی قطعہ یا قصیدہ لکھ کر بھیج دیا لیکن اس ملازمت کے بعد سے میرے تعلقات قلعے سے بڑھتے ہی گئے، جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ پہلے مرزا فخرو ولی عہد کا استاد بنا پھر بہادر شاہ کا استاد بنا۔ تاہم یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ میں اسی زمانے سے ملکہ وکٹوریہ کا درباری شاعر بننے کا متمنی تھا، بہرحال جب سنہ۱۸۵۷ء میں میں نے باغیوں کی لشکر کشی اور بہادر شاہ ظفر کی تاجپوشی دیکھی تو میں کچھ ڈگمگایا ضرور۔ یہ اندیشہ گزرا کہ شاید زمانہ پلٹ جائے اور مجھے اسی حلقے سے وابستہ ہونا پڑے۔ غالب جو کہ مصلحت اندیش اور دام و درم کے معاملے میں گرہ کا پکا تھا۔ اس نے وہی رویہ اختیار کیا جو کہ عام شہریوں کا تھا۔ پھر یہ کہ میں انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا نہ کہ ان کا زرخرید غلام ظلم خواہ انگریزوں کا ہو یا ہندوستانیوں کا مجھے پسند نہ تھا۔ میں ظلم کا شدید مخالف تھا۔ اگر ایک طرف مجھے ان انگریزوں کے مارے جانے کا غم تھا جو یا تو میرے دوست یا شاگرد تھے یا پھر "امیدگاہ" تھے تو دوسری طرف اس سے بڑا غم ان اہل شہر کے ہلاک کئے جانے کا تھا جن میں سے بعض میرے اپنے لخت جگر بھی تھے میرا اپنا بھانجا مرزا عاشور بیگ اور ان کا جوان سال فرزند اسی ہنگامے میں انگریزوں کی گولیوں سے ہلاک ہوا۔ جو ظلم کہ خاکیوں یا انگریزوں نے ڈھایا وہ باغیوں کے تشدد پر سبقت لے گیا "پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا، پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال، ناموس، مکان و مکیں، آسمان و زمین اور آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ انہدام مساکن و مساجد کا حال میں کیا گزارش کروں۔ بانی شہر نے وہ اہتمام مکانات کے بنانے کے سلسلے میں نہ کیا ہوگا، جو اب

والیان ملک کو ڈھانے میں ہے، اللہ اللہ قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئیں کہ کہ ال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں اور جب قلعے میں ان آلات سے کام نہ نکلا تو سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھایا گیا۔ چنانچہ انگریزوں کے انھیں مظالم سے متاثر ہو کر میں نے یہ قطعہ لکھا تھا جسے اپنے دیوان میں مارے خوف کے شامل نہ کر سکا ؎

بسکہ فعال مایرید ہے آج | ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے | زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے | گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک | تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک | آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر بھی | وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوے | سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم | ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

بالآخر ہوا وہی جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ یعنی انگریزوں کی حکومت بدلی اور مجھے اپنی صفائی، پنشن کی بحالی اور خلعت کی بازیابی میں عمر کے بقیہ سال کاٹنے پڑے۔ اس میں ہوس شامل نہ تھی تو اور کیا تھا امام بخش صہبائی توپ دم کر دئے جائیں، شیفتہ جاں بحق ہوں اور میں دیکھتا رہوں، آزردہ کو دریائے شور بھیجا جائے اور شیفتہ سزا پائیں یہ سب کس سے دیکھا جاتا۔ بہر حال اتنے نام ہیں کہ اگر گنوا دوں تو گنوا نہ سکوں۔ میں نے دیکھا کہ اس موقع پر ان کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں لیکن انہوں نے اپنی طبیعت کو روکتے ہوئے کہا، کسی واقعے سے متاثر ہونا ایک بات ہے اور کسی تحریک میں حصہ لینا دوسری بات ہے۔ میں میانہ روی اور سلامت پسندی کا قائل تھا اور اپنی عادتوں کا اس حد تک مارا ہوا تھا کہ میں ایک مخصوص حد سے آگے کسی بھی معاملے میں قدم نہیں بڑھا سکتا تھا۔ سنو میری فطرت نہ تو اس قدر باغی ہے ؎

نہ کر اخبار پاستانے را | دیو افسانہا قیاس کنم
اور نہ اتنی قناعت پسند کہ "مردہ پروری" کو پسند کروں اور دین بزرگاں پر چلوں۔ اور نہ ایسا زاہد کہ حلہ ہائے بہشت کی توقع میں ترک آرائش لباس کنم۔

تم ایک ایسے آدمی سے اس کی توقع نہیں رکھ سکتے ہو کہ وہ اپنی زندگی میں کوئی بڑا خطرہ مول لے سکتا تھا یا کسی ملکی سیاست میں

شوکت علی رائے پوری

قصہ ملباری کی ہوٹل کا

کھٹ... کھٹ.... کھٹ... میں ہڑبڑا کر پلنگ سے کود پڑا۔ اور دروازے کو گھورنے لگا۔ میں یہ سمجھا کہ شاید مالک مکان کرایہ لینے آیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں سٹپٹا سا گیا، مگر دوسرے ہی لمحے میں خالد کی آواز پہچان گیا۔ اب کے اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کے ساتھ آواز بھی دی تھی۔ آواز پہچان لینے کے بعد جب مجھے اچھی طرح یقین ہو گیا کہ یہ سوائے خالد کے کسی اور کی نہیں ہو سکتی، تب میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور کنڈی کھول دی۔ سامنے خالد کھڑا مسکرا رہا تھا۔

کیا یار! اتنی دیر تک سوتے رہتے ہو؟ اس نے خشک لہجے میں کہا

میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا، "اماں یار! شادی کے بعد پہلی بار آج کا دن میری زندگی میں آیا ہے جو اتنی دیر سوتا رہا ہوں، ورنہ تم اپنی بھابی سے اچھی طرح واقف ہو۔ صبح ہی صبح ادھر مؤذن نے اذان دی ادھر انہوں نے لحاف کھینچتے ہوئے ہانک لگائی" اجی سنتے ہو" اجی اٹھو جلدی سے دودھ لاؤ [illegible] ناشتہ پکانا ہے ورنہ بیگم اس بری طرح جھنجھوڑتی ہیں کہ ہوش ٹھکانے لگ جاتے۔ باقی رہی نیند تو وہ بیگم کی کاٹ کھانے والی جھنجھلائی ہوئی آواز سنتے ہی ایسی رفوچکر ہو جاتی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ اور پھر وہی منہ دھونا ناشتہ کرنا، ناشتہ دان سنبھالنا اور ڈیوٹی پر جانا ___ رات گئے آنا۔ الٹا سیدھا کھانا اور سو رہنا۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بھابی وغیرہ گھر پر نہیں ہیں؟ خالد نے قریب ہی ٹوٹے ہوئے ہتھے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ہاں والدہ کی طبیعت بہت خراب تھی انہیں دیکھنے میکے گئی ہیں۔ میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے جواب دیا۔

مگر آج، آپ غریب خانے کا راستہ کیسے بھول گئے؟ میں نے اس سے ایک عرصے بعد آنے کا شکوہ کرتے ہوئے پوچھا!

بس یار! کیا بتاؤں ماجد بھائی ڈیوٹی سے آنے کے بعد کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا دھندا کر لیا کرتا ہوں ورنہ اتنی قلیل تنخواہ میں اس مہنگائی کے دور میں گزارا کہاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت دنوں تک ملاقات نہ کر سکا آج فرصت ملتے ہی حاضر ہوا ہوں۔ اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ملاقات نہ کر سکنے کی وجوہات بتائیں۔

خیر چھوڑو بھی! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آج بھابی گھر پر نہیں ہیں تو کیا چائے بھی نہیں ملے گی۔؟

اماں یار! اب گھر میں چولہا جلانے کا کھڑاگ کون کرے گا۔ میں منہ دھو لوں تو چلتے ہیں ملباری کی ہوٹل پر بیٹھیں گے۔ میں نے صابن دانی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ جب تک میں منہ دھو کر کپڑے تبدیل کرتا رہا۔ وہ بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میں نے دروازہ بند کر کے باہر کی کنڈی لگائی اور تالے میں چابی لگائی۔ اور دونوں دوست چل پڑے۔ قریب ہی گلی کے نکڑ پر ملباری کی ہوٹل تھی ہم جلد ہی پہنچ گئے۔

خالد نے کونے والی خالی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا! چلو وہاں بیٹھیں گے۔ ٹیبل والے کو دو چائے لانے کا اشارہ کرتے ہوئے ہم دونوں بیٹھ گئے اس وقت ہوٹل میں کچھ زیادہ رش نہیں تھا ورنہ بس اسٹاپ قریب ہونے کی وجہ سے عموماً بہت کم میزیں خالی ہوتی ہیں۔ ہماری دائیں طرف کی میز پر ایک صاحب بیٹھے بری طرح سگریٹ پھونکنے میں مصروف تھے اور سامنے والی میز پر دو اپ ٹو ڈیٹ قسم کے صاحبان تشریف فرما تھے جن کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے اور درمیان میں میز پر آج کا اخبار پھیلا ہوا تھا دور سے ہی سرخی صاف پڑھی جا رہی تھی جو کچھ اس طرح تھی۔

"شاداب ٹیکسٹائل ملز کے ہڑتالی مزدوروں پر پولیس کا لاٹھی چارج"

"مزدوروں کی طرف سے پولیس پر سنگ باری"

"پولیس نے اپنے بچاؤ کی خاطر گولی چلا دی"

"کئی مزدور ہلاک و زخمی، زخمیوں میں پولیس والے بھی شامل ہیں"

ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے حضرات میں سے ایک صاحب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے دوسرے ساتھی سے یوں گویا ہوئے: "ابی صاحب آج تک اس اہم مسئلے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی کہ آخر حالات اتنی سنگین نوعیت کیوں اختیار کر جاتے ہیں؟ جس سے لاٹھی چارج، آنسو گیس، اور فائرنگ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

دوسرے صاحب نے سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا! ابی چھوڑیے اس تذکرے کو آپ بھی کہاں ان مزدوروں کا رونا لے بیٹھے۔ ارے صاحب یہ نیچ ہیں ہی اس قابل ... اگر انہیں دبا کر نہ رکھا جائے تو سر چڑھ جاتے ہیں۔ ان کی بھی ایک ہی رہی یہ تو ناشکرے ....

اب اسی خبر کو لے لیجئے، اس میں ان کے مطالبات کتنے مضحکہ خیز ہیں۔

کہتے ہیں کہ اتنی قلیل تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا لہٰذا تنخواہ بڑھائی جائے' طبی امداد دی جائے ہمارے بچوں کو میٹرک تک مفت تعلیم دی جائے وغیرہ وغیرہ۔

یہی نہیں بلکہ اپنے مطالبات منوانے پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تو ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور صنعتی ترقی کے میدان میں ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ کہ یہ ہمارا پیدائشی حق ہے ہمیں ملنا چاہئے اسی طرح اور بھی نہ جانے کیا کیا بکتے ہیں۔

اب آپ ہی غور کریں کہ ان حالات میں ان پر لاٹھی چارج، آنسو گیس اور ضرورت پڑنے پر گولیاں استعمال نہ کی جائیں تو کیا انھیں سر پر بٹھا لیا جائے؟

ان صاحب! اگر انھیں ذرا بھی ڈھیل دی جائے تو ملک کے مالک بن بیٹھنے کا خواب دیکھنے لگتے ہیں۔

اب سوچئے تو، کیا یہ زبردستی نہیں ہے کہ مہنگائی بڑھ گئی ہے' لہٰذا تنخواہ بڑھائی جائے ورنہ ہم ہڑتال کر دیں گے؟؟ اب ان بے وقوفوں کو کون سمجھائے۔ کہ کیا مہنگائی کا کسی نے ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ ارے بھئی جتنا کام کرتے ہیں، اس کی اُجرت مل جاتی ہے۔ اب رہی طبی امداد تو وہ ہر مل کی ڈسپنسری میں بخار کی گولیاں، مکسچر اور انجکشن وغیرہ ملتے ہیں اس میں بھی بیمار مزدور شفایاب نہ ہو تو اس میں بے چارے مل مالک کا کیا قصور؟ شفا دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔

مگر صاحب وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ قسمت میں جتنے دن کی بیماری' دکھ اور تکلیف لکھی ہوتی ہے۔ سو وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ اس میں تو مل مالک کو مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اب باقی رہ جاتی ہے' یہ بات کہ ان کے بچوں کے لئے میٹرک تک مفت تعلیم کا بندوبست۔۔۔۔ تو صاحب آپ ہی بتائیں کہ ان کے بچوں کو بھی بڑے ہو کر مزدوری کرنی ہے تو انھیں تعلیم دلانے سے کیا حاصل؟

اور بھائی میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ مزدور کی اولاد کو تو مزدور ہی رہنا چاہیے' اگر تمام لوگ تعلیم یافتہ ہو گئے' تو ملوں میں کون کام کریگا؟

اب آپ ہی بتائیے! کہ ان کے مطالبات کس حد تک جائز ہیں اور یہ کہ کیا یہ لوگ قابل سزا نہیں ہیں؟ بھلا بتلائیے تو کارخانوں میں سرمایہ بیچارے سرمایہ دار لگائیں اور مزدور اس کے خواہ مخواہ پیدائشی حقدار بنے پھرتے ہیں۔

یہ بھی خوب رہی، تھوڑی دیر کے لئے سوچئے' اگر سرمایہ دار صنعتوں کے قیام میں اپنا سرمایہ نہ لگائیں تو کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ مگر وہ بے چارے تو خود اپنا سرمایہ محض اس لئے پھنساتے ہیں کہ غریب مزدوروں کو روزگار مل سکے۔ اور یہ ناشکرے احسان فراموشی پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔ جب دیکھو اپنی تخریبی سرگرمیوں میں مشغول ہیں، اگر اس مقام پر ارباب اقتدار ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے، ان بدمعاش، تخریب پسند اور سرپھروں کے دماغ درست کرنے کیلئے انھیں جیلوں میں بند کر دیں یا فائرنگ کر کے خاموش کر دیں تو کونسا آسمان ٹوٹ پڑا؟؟

کوئی سال خالی نہیں گیا ہوگا، جس میں ہماری حکومت نے ان بدمعاشوں کی تخریبی کارروائیوں کو کچلنے کے لئے' اچھا خاصہ سرمایہ نہ صرف کیا ہو! مگر یہ ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔ میرے خیال میں تو، ان تمام مصیبتوں اور مستقل دردسری سے چھٹکارا پانے کا صرف یہی علاج ہو سکتا ہے کہ ایک، ایک مزدور سے چار چار مزدور کا کام لیا جائے۔ تاکہ ان سرپھروں کے ذہن میں تخریبی سازشیں جنم نہ لے سکیں اور نہ ہی انھیں سوچنے کا موقع مل سکے۔ جس کے باعث ہر وقت ہماری قومی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ پھر بھی کسی ذہن میں بغاوت کے کیڑے کلبلانے لگیں تو اسے ملکی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے اور صنعتی امن تباہ کرنے کے جرم میں سرعام پھانسی کی سزا دی جائے اور اس کا سر تن سے جدا کر کے مل کے گیٹ پر لٹکا دیا جائے تاکہ اس بغاوت کا عبرتناک انجام دیکھ کر سب کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔

اماں یار! ختم بھی کرو۔ اس قصے کو۔ تم نے تو اچھا خاصہ موڈ خراب کر کے رکھ دیا۔ یہ آواز پہلے والے صاحب کی تھی۔ پھر وہ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے اٹھ کھڑے ہوئے اور کاؤنٹر پر بل ادا کر کے باہر نکل گئے۔

خالد چائے پیتے ہی جانے کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر سامنے بیٹھے ہوئے حضرات کی گفتگو سننے میں اس حد تک محو تھا کہ اس کا احساس ہی نہ رہا۔

اب آہستہ آہستہ ہوٹل کی ہما ہمی شباب پر آتی جا رہی تھی تقریباً تمام میزیں بھر چکی تھیں، سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں اور پیالیوں کی کھنک میں اضافہ ہو چلا تھا۔ میں لاشعوری طور پر اٹھا اور کاؤنٹر پر پہنچ گیا پیچھے سے ٹیبل والے نے ہانک لگائی۔ تین آنہ ٹیبل بھائی سے تین آنا۔"

میں کاؤنٹر پر تین آنے رکھ کر باہر نکل آیا اور غیر ارادی طور پر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور بھی نہیں چل پایا تھا کہ اچانک میرے کانوں سے مزدور اتحاد کا پر اثر نعرہ ٹکرایا پیچھے مڑ کر دیکھا تو سامنے سے مزدوروں کا ایک بہت بڑا جلوس آتا دکھائی دیا۔ یہ شاداب ٹیکسٹائل ملز کے ہڑتالی مزدوروں کا جلوس تھا جو گزشتہ دن پولیس کے ناروا سلوک کی بنا پر احتجاجی طور پر مزدوروں نے نکالا تھا۔ مزدوروں کے ہاتھوں میں بڑے

بڑے بیز تھے جن پر "ہمارے مطالبات پورے کرو" "شہید مزدوروں کے ورثاء کو معاوضہ دیا جائے" کے مطالبات تحریر تھے۔

مزدوروں کا جلوس دیکھنے، دکانوں، مکانوں اور ہوٹلوں سے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ ٹریفک رک گیا تھا۔ سب کی نظریں جلوس پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک مخالف سمت سے پولیس کی گاڑیوں کا تانتا سا بندھ گیا، اور دائیں طرف میدان میں فولادی ٹوپیاں پہنے ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے ہوئے پولیس کے جوان جمع ہونے لگے۔

پولیس پر نظر پڑتے ہی مزدوروں کے نعروں میں شدت پیدا ہونے لگی۔ پولیس والوں نے مزدوروں کی پیش قدمی روکنے کیلئے پورے روڈ پر صف بندی کرکے کھڑے ہوگئے مگر جلوس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ سمندر کی سرکش لہروں کی مانند نعرے لگاتے برابر آگے ہی بڑھتے رہے، جیسے ہی فاصلہ کم ہوا پولیس نے انھیں منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج شروع کردیا مگر بے سود۔ مزدوروں کے عزم و حوصلے میں کوئی فرق یا لاٹھی چارج کا کوئی اثر نہ دیکھ کر دور سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے موٹی توند والے افسر نے سپاہیوں کو تقریباً دھاڑتے ہوئے حکم دیا فائر!..

اور پھر جلوس کے آگے سرخ جھنڈا تھامے ہوئے چیتھڑوں میں ملبوس ایک نوجوان کے چوڑے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور وہ مزدور اتحاد کا فلک شگاف نعرہ لگاتے ہوئے ڈھیر ہوگیا۔

میں نے مزدوروں کے مجمع پر بغور نظر ڈالی مگر وہاں مجمع خوف و ہراس یا ان کے ہوش ٹھکانے لگے نظر نہیں آئے بلکہ ان کے پرعزم چہرے دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا جیسے لوٹ کھسوٹ اور جبر و ظلم خود ٹھکانے لگنے جارہا ہو!

بقیہ غالب کی زبانی

حصہ لیتا۔ لیکن جہاں تک میرے خیالات اور افکار کا تعلق ہے اس پر مجھے اب بھی فخر ہے کہ میں اپنے ہم عصروں سے زیادہ ترقی پسند تھا۔ ایک ایسے زمانے میں جبکہ زیادہ تر لوگ تجدید مذہب اور شرع ہنگامہ خیز کے احیاء میں مشغول تھے میں نے منصور اور فیثاغورث کو آواز دی اور اہل وطن کو مغرب کی ایجادات کی طرف متوجہ کیا ؎

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوییم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت
آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت
کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ ما را
مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

غالب
خطوط کے آئینے میں

حاجی عدیل

غالب کی تلاش و جستجو میں لکھے جانے والے ہزاروں تحقیقی مضامین و مقالات اور کتابیں ایک طرف اور غالب کے خطوط ایک طرف رکھ دیئے جائیں تو غالب کا پلا بھاری رہے گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غالب نے اپنے متعلق اپنے حالات زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا وہ یقیناً صحیح لکھا ہے۔ اسی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر غالب کو اپنی بھرپور شکل میں دیکھنا ہے تو خطوط غالب ہی وہ آئینہ ہے جس میں غالب اپنی تمام تر خوبیوں اور کمزوریوں کے نظر آتا ہے فارسی اور اردو کے اشعار یا قصائد میں غالب کی شخصیت و کردار کے پیکر کی تلاش و جستجو کرنا ایسا ہی ہے جیسے سورج کی تیز روشنی میں آسمان پر ستارے تلاش کرنا۔ خطوط غالب کے سلسلے میں بھی ہمیں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جب ہم خطوط کے آئینہ میں غالب کو دیکھیں تو غالب کے دور کے تاریخی حالات کو نظر انداز کرنے کی غلطی نہ کریں ان تمام تاریخی حالات، واقعات، حادثات اور سانحات کو نظر انداز کر کے جن میں غالب کی ذہنی نشوونما ہوئی ہے ہم غالب کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ بغیر اس کے غالب کی رنگارنگ شخصیت کا نقش کھینچنا قطعی ناممکن ہے۔ تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے یاروں نے بہت زور مارا کہ کسی طرح غالب کی شخصیت اور اس کے فن پر روشنی ڈالیں لیکن وائے محرومی کے بیچارے "مگر" ... "مگر" ... "چونکہ" "چنانچہ" کے دائرے میں ہی گم ہو کر رہ گئے۔ اور غالب پوری ایک صدی سے محو نظارہ کار طفلاں ہے۔ آج بھی غالب کے پرستار فن تحقیق کے آستان و سنگ پر سرگرداں ہیں کہ کسی طرح جستجوئے نگاہ تجسس غالب اور اس کے فنی نقطہ رس کا گل اور حسن نظارہ کر کے امر ہو جائے۔ لیکن "ہنوز دلی دور است" جہاں تک غالب کے فارسی اور اردو اشعار کا تعلق ہے وہ غالب کی رنگینی، جمیع، نکتہ آفرینی، زبان دانی اور قدرت کلام کے بے بہا جواہر سے تعمیر کردہ عمارتیں ہیں غالب کا ہر شعر ایک روزن ہے جس سے ہم غالب کے علم و ہنر اور قادر الکلامی کا نظارہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی شخصیت کا بھرپور نظارہ ممکن نہیں۔ کچھ صاحب علم و فہم حضرات نے غالب کے قصائد کو بنیاد بنا کر غالب کے اندر جھانکنے کی ناکام کوشش کی اور جب کچھ سجھائی نہیں دیا تو غالب کو ہی جبر کے مسلوں میں سنگ کر اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا اور خاموش ہو رہے۔ اگر یہ صاحب فہم حضرات اگر غالب کی شخصیت کے اجزا کا گہری نظر سے مشاہدہ کرتے تو یقیناً ان کی رسائی اس ماحول تک ہو جاتی جس میں غالب کی ذہنی نشوونما ہوئی تھی وہ سڑا ہوا جاگیردارانہ ماحول جو اپنے زوال کی آخری منزلوں سے گزر رہا تھا۔ بظاہر مستحکم رشتے ناطے تہذیب و تمدن اور فرسودہ روزگار کا شیرازہ بکھیر رہا تھا کہ اس تاریخی شکست و ریخت کے عمل و انتشار نے ایک آخری جست لگائی اور تاریخ ہند نے ۱۸۵۷ء کا حادثہ، سانحہ یا واقعہ رقم کر دیا۔ یہ ہے وہ ماحول جس میں غالب کی ذہنی عمارت تعمیر ہوئی۔ اگر ہم ان حقائق کو نظر انداز کر دیں اور کلام غالب اور خطوط غالب کے بخئے ادھیڑتے رہیں تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

غالب نے اپنے اشعار کے علاوہ اپنی معاشی پسماندگی، مفلسی و کسمپرسی، بیماری اور لاچاری کا تذکرہ اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔ لیکن ایسے خطوط کی تعداد جس میں اپنی ذاتی پریشانی کا ذکر ہو بہت کم ہیں بایں ہمہ جو ہیں وہ نگاہ بینا کے لئے بہت ہیں۔ غالب کے "محققین" کے لئے ہم غالب کے ڈھیر سارے خطوط میں سے وہ اقتباسات نذر کے صفحات پر پیش کر رہے ہیں جس میں غالب کی معاشی بدحالی کے وہ اشارے ملتے ہیں جن سے تنگ آ کر غالب نے ہر ایرے غیرے کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے اور آج غالب جیسے عظیم ترین اردو شاعر کی صد سالہ برسی منانے والے غالب دوست افراد اس امر پر تلملا کر رہ جاتے ہیں کہ وہ حالات کتنے ظالم تھے جن میں غالب کو ایک نان جویں کی حسرت میں قصیدے جیسی صنعت سخن میں بھی طبع آزمائی کے لئے مجبور ہونا پڑتا تھا

(مرتب :- حاجی عدیل)

دوشنبہ ۱۹ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آگیا۔ وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے بہشت ہے۔" ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء

"ساٹھ برس کا مر گیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رام پور سو روپے مہینہ دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں جو کچھ مجھ کو آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجیے تو میں نمک خوار ہوں ورنہ خیرات خوار ہوں اور اگر عطیہ بشرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔" ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء

"میں زندہ ہوں لوگوں کے خبر میں جو اپنے کو مردہ لکھتا ہے وہ باعتبار ترک اصلاح نظم لکھتا ہے۔ ورنہ زندہ ہوں، مردہ نہیں، بیمار بھی نہیں، بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرضدار، ہمانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار۔"

"اب میں کہانیاں، قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں؟ کتاب نام کو میرے پاس نہیں۔ پنشن مل جائے، حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔" "پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی گلاں سوجھیاں۔"

"میاں کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں، جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا" ۱۸۶۲ء

"تنخواہ کی سنو۔ دو برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے تو مدد خرچ کے چار سے رہ کر گئے ڈیڑھ سو متفرقات میں اٹھ گئے۔ مختار کار مہر زادہ آیا چونکہ میں اس کا قرضدار ہوں، روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ یہ حساب کیجیے۔ حساب کیا۔ سو روپے کم پندرہ سو روپے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا میرے قرض متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ گیارہ سو روپے بانٹ دے۔ تو سو بچے آدھے تو لے اور آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو پانچ سات سو تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا۔ تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔" ۱۸۶۰ء

"برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خان کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا وہ گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلمدان سب توشے خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط لکھوں کیا بیٹھ کر؟" ۱۹ دسمبر ۱۸۶۲ء

"موحد ہو کر علی کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔" ۱۵ جولائی ۱۸۶۶ء

(باقی صفحہ ۵ پر)

بزمِ منشور

فارم رکنیت

نام ـــــــــــ ولدیت ـــــــــــ

پیشہ ـــــــــــ تعلیم ـــــــــــ

عمر ـــــــــــ مشاغل ـــــــــــ

گھر کا پتہ ـــــــــــ

ـــــــــــ

دفتری یا کاروباری پتہ ـــــــــــ

ـــــــــــ

جس جگہ ملازم ہیں کیا وہاں کوئی یونین ہے ؟ ـــــــــــ

اگر یونین ہے تو یونین کا نام ـــــــــــ

اگر یونین ہے تو کیا آپ یونین کے رکن ہیں ؟ ـــــــــــ

کیا آپ یونین کے کسی عہدے پر فائز ہیں اور اگر ہیں تو کس عہدے پر فائز ہیں ؟

ـــــــــــ

جناب مدیر "منشور" !

میں ادارۂ "منشور" کی تجویز کے مطابق ماہ اپریل [illegible] کے اداریہ کے مندرجات اور "منشور" کی پالیسی سے کلی اتفاق رکھتے ہوئے بزمِ منشور کی رکنیت کا خواستگار ہوں، اور آپ کو یقین دلاتا ہوں / دلاتی ہوں کہ منشور کی ترقی و بقا نیز "منشور" کے مقاصد کی ترویج و فروغ کیلئے پوری پوری کوشش کروں گا / گی !

مورخہ ـــــــــــ دستخط ـــــــــــ

بقیہ خبریں

پولیس اور انتظامیہ کی عدم مداخلت حق ہڑتال کی بحالی ۔ مزدور طبقے کی قیادت اور کسانوں سے مضبوط اتحاد اور طالب علم، دانشور اور دیگر محب وطن عناصر کے متحدہ محاذ کے ذریعے ملک میں حقیقی سیاسی و سماجی مساوات کا ماحول پیدا کرنے کیلئے عوامی جمہوریت کے قیام کے مقصد کو مزدوروں اور عوام کے دکھ درد کا حقیقی علاج قرار دیتے ہوئے ۔ اس کی پوری تائید و حمایت کی اور اپنے اس ایقان کا اظہار کیا کہ مغربی پاکستان کا مزدور طبقہ کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی قیادت میں اپنا واقعی کردار ضرور انجام دے گا۔

کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی مجلس عاملہ کے دو ممبران کی تحفظ امن عامہ کے تحت گرفتاری کی مذمت

کرفیو سے مزدوروں کو پہنچنے والے نقصانات پورے کئے جائیں

کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کا مطالبہ

کراچی ۲۰ جنوری ۔ کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے ایک اعلامیہ کے مطابق کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے ممبران مجلس عاملہ محمد سلیمان ڈویژنل جنرل سکریٹری کراچی ریلوے ورکرز یونین اور محمد حسین ملٹے ہاؤس ایمپلائز یونین کے صدر کو کراچی پولیس نے ملیر سے ۲۰ جنوری بروز اتوار کو اس وقت گرفتار کیا جبکہ وہ اپنے ذاتی کام سے ملیر گئے ہوئے تھے دو دن تک گھر سے غائب رہنے پر ذاتی تلاش کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا کہ دونوں کارکنوں کو ڈپٹی کمشنر کراچی کے حکم سے تحفظ امن عامہ کے تحت کراچی جیل میں بند کر دیا گیا ہے ان کی گرفتاری کی وجہ سے مزدوروں میں شدید نفرت اور غصے کے جذبات پھیل رہے ہیں اور انتظامیہ کے غیر دانشمندانہ اقدامات کی وجہ سے صورت حال مزید خراب ہونے کا اندیشہ ہے کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی جانب سے نکالے جانے والے اعلامیہ میں کراچی میں پُرامن شہریوں پر پولیس کے ظلم و تشدد کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی گئی ہے ۔ اور شہر کی بارہ لاکھ آبادی کو کرفیو کے ذریعے قید و بند کی صورتحال سے دوچار کرنے پر انتظامیہ پر کڑی تنقید کی ہے ۔ اور کرفیو کی وجہ سے مزدوروں کو جو نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے جس کے نتیجے میں وہ اور ان کے افراد خاندان فاقہ کشی میں مبتلا ہیں ۔ انھیں اس کا معاوضہ ادا کئے جانیکا مطالبہ کیا گیا ہے۔

بزم منشور ملتان کی تنظیمی کمیٹی کا چناؤ

ملتان ۷ فروری (نمائندہ منشور) آج یہاں جناب عارف محمود قریشی کی صدارت میں بزم منشور کے اراکین اور ہمدردوں کے ایک عام اجلاس میں چھ افراد پر مشتمل تنظیمی کمیٹی کا چناؤ عمل میں آیا ۔ اجلاس نے متفقہ طور پر جناب محمد رفیق کو کمیٹی سکریٹری اور جناب محمد تقی، جناب عارف محمود قریشی، جناب محمد اسحاق اور جناب محبت علی وارثی کو رکن نامزد کیا ۔ جناب محمد علی کو بزم کا نگران مقرر کیا گیا۔

اجلاس میں عارف محمود قریشی کے علاوہ طالب علموں میں سے منظر مہدی اور ناصر عباس مزدور کارکنوں میں سے اشرف حسین رضوی اور ممتاز آباد سے محبت علی وارثی ۔ چھاؤنی سے جناب محمد رفیق ۔ شیر شاہ سے محمد تقی ٹھاد فیکٹری سے عبدالعزیز خان نیازی اور شہر سے سجاد نے اجلاس سے خطاب کیا ۔ اور بزم منشور کے اغراض و مقاصد کو فروغ دینے کا عزم کیا ۔ مقررین نے اس بات کا اعادہ کیا کہ نہ صرف دانشوروں بلکہ مزدوروں، کسانوں ۔ طالب علموں اور تمام عوام دوست طبقات پر مشتمل مضبوط و متحدہ محاذ کا قیام پاکستان کے عوام کے مسائل کے حل کی جدوجہد کیلئے ناگزیر ہے۔

تنظیمی کمیٹی نے ۱۰ فروری کو اپنے اجلاس میں بزم کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کیلئے ایک پروگرام طے کیا ۔ جس میں ایک اور عام اجلاس میں پروگرام کی توثیق کے بعد ایک عظیم الشان افتتاحی اجلاس اور ادبی نشست کا انعقاد بھی شامل ہے، جس میں ادیبوں اور شعراء کے علاوہ بزم کی مرکزی تنظیم کے کارکنوں اور ادارہ منشور سے منسلک افراد کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے گی۔

پیرس ملز لانڈھی کے مزدور لاقانونیت کے شکار ہیں

کراچی (نمائندہ منشور) پیرس ملز یونین کے جنرل سکریٹری مسٹر [illegible] نے منشور کو بتایا کہ پیرس ملز لانڈھی میں کام کرنے والے مزدور کافی عرصے سے انتہائی افسوسناک صورت حال کا شکار ہیں جس کے لئے یونین نے منتظمین کو ایک ہڑتال کا نوٹس دیا تھا لیکن منتظمین کی روایتی ہٹ دھرمی، مخالف یونین اور مزدور دشمن رویے کی بنا پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور ناکامی کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا [illegible] منتظمین نے یونین کے عام ممبران اور عہدیداروں کو اپنی انتقامی کارروائی کا نشانہ بنانا شروع کر دیا چنانچہ اس سلسلہ میں تقریباً ۹ عہدیداروں اور سرگرم کارکنوں کو برطرف [illegible]

کام پر آنے سے روک دیا اس غیر قانونی تالہ بندی کے خلاف احتجاج کیا گیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا چنانچہ ۴ فروری کو "اے" شفٹ کے مزدوروں نے کام پر جانے سے انکار کر دیا بعد المحق آفیسر جناب ساجد فاروقی کی مداخلت پر یونین کے رہنما غیر قانونی تالہ بندی ختم کرانے میں کامیاب ہو گئے نیز اس بات کا وعدہ کیا گیا کہ ① تین ماہ پورے ہونے سے قبل جن مزدوروں کو مسلسل کئی کئی سال تک برخاست کیا جاتا رہا ہے تاکہ وہ مستقل نہ ہو سکیں انہیں مستقل کر دیا جائے گا ② فوری طور پر نکالے ہوئے آدمیوں کو واپس بلا لیا جائے گا ③ پاکستان یونین کے مقابلے میں استصواب رائے کرایا جائے گا یونین کے صدر جناب نایاب علی نے بتایا کہ پریس ملز کے مالکان نہ تو جافری کا ریٹ دیتے ہیں اور نہ ہی بونس اور اوور ٹائم کی ادائیگی کرتے ہیں نیز ان دھاندلیوں کے خلاف آواز اٹھانے والے مزدوروں کو زد وکوب کیا جاتا ہے یونین کے ایک ترجمان نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اب مزدوروں کے بڑھتے ہوئے اتحاد کے ذریعہ بہت جلد مذکورہ دھاندلیوں پر قابو پالیا جائے گا۔

مزدوروں کو اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنی چاہئے

طفیل عباس

سیاست صرف سرمایہ داروں، جاگیرداروں کی میراث نہیں

معراج محمد خاں

اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ ورکرز یونین کا کراچی مزدور مرکزی کمیٹی سے الحاق

لانڈھی ۲۳ فروری آج یہاں کراچی مزدور کمیٹی (علاقائی) کے زیر اہتمام ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے جناب طفیل عباس صدر کمیٹی نے مزدور کارکنوں کو تلقین کی کہ وہ اپنے مسائل حل کرنے کے لئے متحد ہو جائیں آج مراعات مانگنے کا زمانہ نہیں بلکہ اپنے غصب شدہ حقوق حاصل کرنے کا وقت ہے لیکن کیونکہ مزدور طبقہ کسی پروگرام کے تحت ملک گیر پیمانہ پر منظم نہیں ہے اس لئے ہم صرف مزدور قوانین یا اس قسم کے دیگر معاملات میں مراعات کے خواہاں ہیں جناب طفیل عباس صدر کراچی مزدور مرکزی کمیٹی لانڈھی کورنگی کی مزدور انجمنوں کے عہدیداروں اور مجلس عاملہ کے ممبران سے خطاب کر رہے تھے جن کا الحاق کراچی مزدور مرکزی کمیٹی سے ہو چکا ہے آج کے جلسہ میں "اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ ورکرز یونین" نے کمیٹی سے الحاق منظور کر لیا اس موقع پر جناب طفیل عباس نے فرمایا کہ ہمیں اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنی پڑے گی اگر ہم صرف آنکھیں بند کر کے چلتے رہے تو اس کا منطقی نتیجہ بہر حال برآمد ہوگا موصوف نے بتایا کہ تمام دنیا کے لٹیروں کا سردار امریکی سامراج ہے اور اس کی شہ پر افریشیائی ممالک میں بھوک، افلاس، جہالت اور بے روزگاری کے بادل چھائے ہوئے ہیں ان مصائب کا خاتمہ صرف اور صرف مزدور کسان کے اتحاد کے ذریعہ ہی ممکن کیا جا سکتا ہے کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ ملک گیر پیمانے پر صحیح قیادت میں ایک واضح اور مثبت پروگرام کی بنیاد پر مزدوروں اور کسانوں کی ایک انقلابی تنظیم بننی چاہئے۔ موصوف نے امید ظاہر کی کہ ہم جلد از جلد اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسی جلسہ میں جناب واحد بشیر نے بھی تقریر کی۔ موصوف نے کراچی مزدور کمیٹی کے کام کی نوعیت کے سلسلے میں حاضرین کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ہم ایک واضح مقصد کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اور وہ ہے مزدور کسان طبقہ کی بالادستی ہمیں معلوم ہے کہ یہ مشکل کام ہے لیکن ہم اپنے طبقے کے انقلابی کردار سے بخوبی واقف ہیں اس لئے تمام رکاوٹوں کے باوجود ہم بہت تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں موصوف نے کہا کہ ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ مزدور جماعتوں کو کسی سیاسی پارٹی کا آلۂ کار نہیں بننا چاہئے لیکن جو جماعت بھی ہمارے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے کام کرے گی ہم اس سے تعاون کریں گے نیز انفرادی طور پر تمام مزدوروں کو ایسی جماعت کی حمایت کرنی چاہئے جو عوامی جمہوریت یا ان کے مطالبات کی بات کرتی ہیں جلسہ سے جناب معراج محمد خاں اور مسٹر شہریار نے بھی خطاب کیا جناب معراج محمد خاں نے بتایا کہ میں جب بھی اپنے آپ کو اپنے مزدور دوستوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے روحانی مسرت ہوتی ہے۔ موصوف نے کہا کہ یہ کہنا غلط ہوگا کہ مزدوروں کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہئے دراصل یہ بکنے والے سرمایہ داروں کے نمائندہ ہیں وہ سیاست کو صرف "بڑے بڑے" لوگوں کی میراث سمجھتے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ آج جو سیاست ہمارے ملک میں چل رہی ہے وہ تمام لوگوں نے شروع کی اور رنگ اس سے بہت کچھ سیکھ رہے ہیں موصوف نے ایک سیاسی رہنما اور وکیل کی حیثیت سے اپنی تمام خدمات مزدور طبقہ کے لئے وقف کرنے کا اعلان کیا ہے جناب شہریار نے پیپلز پارٹی کی طرف سے مزدوروں کو ان کے حقوق کی جدوجہد میں اپنی پارٹی کے پورے تعاون اور امداد کی پیشکش کی موصوف نے تمام قانونی معاملات میں اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لانڈھی کورنگی کے مزدور متحد ہو کر ایک ایسے پلیٹ فارم پر متحد ہو رہے ہیں جو ان کا اپنا اور ایک واضح نصب العین کا حامل ہے جلسہ میں سب سے پہلے کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے نائب صدر جناب [illegible] نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ گذشتہ دنوں اس علاقے کے مزدوروں نے طبقاتی شعور کی جدوجہد کے ذریعہ اپنے اتحاد کو مضبوط کیا ہے اور اس وقت تک کئی انجمنیں بن چکی ہیں اور ہماری صفوں میں [illegible] سٹیل کارپوریشن کی یونین کے شامل ہونے سے جان آ رہی ہے امید ہے کہ کورنگی لانڈھی کے مزدور ایک مضبوط اتحاد بنانے کی عظیم جدوجہد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

غالب خطوط کے آئینے میں

"پنشن جاری ہو گئی، تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے قرض ستاسی روپے گیارہ آنے بچے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے مگر ابھی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے۔ دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سیکڑہ اسلاف عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپیہ مہینہ آیا۔ باسٹھ آنے کے ساٹھ رہیں گے۔" ستمبر ۱۸۶۰ء

"سنو صاحب۔ میں نقز آلودہ کیش ہوں۔ دنیا دار نہیں۔ مکار نہیں۔ خوشامد میرا شعار نہیں۔ جس میں جو صفات دیکھتا ہوں بیان کرتا ہوں خستہ

خالد حمیدی

طفیل عباس سے انٹرویو

"وطن کی ترقی کے لئے جد وجہد کرنا اور رجعت پرست طاقتوں کے خلاف بغاوت کرنا محنت کش طاقتوں کا حق بھی ہے اور فرض بھی"

طے شدہ وقت پر میں طفیل صاحب کے مکان پر پہنچا اور پھاٹک سے گزر کر ڈرائینگ روم کے دروازے پر دستک دی۔ "فرمائیے؟" ایک نوجوان نے برابر کے کمرے سے باہر نکل کر دریافت کیا۔ چہرہ میرے لئے اجنبی تھا۔ "طفیل صاحب سے ملنا چاہتا ہوں!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ تو یہاں نہیں رہتے" اور اس سے پہلے کہ مجھ پر حیرت کا دورہ پڑتا انہوں نے خود ہی جملہ مکمل کر دیا۔ "دیکھئے وہ سامنے لال دروازے والے مکان میں شفٹ ہو گئے ہیں" میں ان سے معذرت کے بعد ہرے دروازے والے مکان کی طرف بڑھا۔ میرے لئے یہ دوسرا موقع تھا کہ میں طفیل صاحب کے یہاں گیا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے مکان تبدیل کر لیا ہے۔ میں نے سوچا کہ ذاتی مکان نہ ہو تو آدمی کو اسی طرح مکان بدلتے رہنا پڑتا ہے۔

طفیل صاحب منتظر تھے۔ مدیر منشور سبط اختر بھی موجود تھے۔ بیٹھنے کے بعد کچھ دیر حالات حاضرہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اس دوران میں کمرے کا جائزہ بھی لیا۔ ساز و سامان وہی تھا جو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ البتہ سیٹنگ نئے کمرے کی مناسبت سے بدلی ہوئی تھی۔ ایک چیز البتہ تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ شیشے آرائش کے شوکیس پر چڑھیں اوڑھے تنگ کا خوبصورت پیالہ اسی طرح رکھا ہوا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں محسوس کیا کہ طفیل صاحب جلد از جلد اصل موضوع پر آنا چاہتے ہیں۔ وہ انٹرویو کے لئے ذہنی طور پر بالکل تیار نظر آتے تھے اور ان کے ذہن پر وہ باتیں چھائی ہوئی تھیں جن کا اظہار وہ انٹرویو میں کرنا چاہتے تھے۔ طفیل صاحب کو بار بار دیکھنے کے بعد آج میں ان کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ انٹرویو کے ذریعے ان کے خیالات کے علاوہ ان کی شخصیت کی ایک جھلک بھی قارئین منشور کے سامنے پیش کروں۔ دراز قد، گٹھا ہوا جسم، کشادہ سینہ، مضبوط اور لمبے ہاتھ، سب مل کر ایک مستحکم اور مضبوط شخصیت کی غمازی کرتے تھے۔ جسم پر سادہ سا سلیپنگ سوٹ تھا۔ سادگی تو یوں بھی ان کی شخصیت کا ایک حصہ ہے

میں نے کبھی ان کو ٹائی باندھے ہوئے نہیں دیکھا۔ کوٹ پر بھی نہیں! لباس کے بعد میری نظروں نے ان کے خد و خال کا جائزہ لیا۔ ان کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں ان کی آنکھیں ہیں حالانکہ آنکھیں چہرے کے تناسب سے کافی چھوٹی ہیں، لیکن پہلی نظر میں انسان ان آنکھوں میں ہی الجھ کر رہ جاتا ہے۔ تیز چمکتی ہوئی آنکھیں جو سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو کرتے ہوئے کچھ اور بھی سکڑ جاتی ہیں گویا جس موضوع پر بات کر رہے ہیں اس کی تہہ تک اپنی آنکھوں کی مدد سے پہنچ رہے ہیں۔ اور ہاں، طفیل صاحب کی آنکھیں بڑی سچی ہیں مگر ساتھ ہی چغلخور بھی۔ ان کی صحیح ذہنی کیفیت کا اندازہ ان کی آنکھوں سے فوراً لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا چہرہ تاثرات چھپانے یا ان پر مصلحت کا پردہ ڈالنے کا قطعی عادی نہیں۔ یہ بات ان کی زبان میں بھی ہے۔ وہ جو محسوس کرتے ہیں اسے چھپائے بغیر صاف کہہ دیتے ہیں اگر وہ کسی بات کو صحیح سمجھتے ہیں تو آنکھوں میں چمک آجاتی ہے اور ہاں کہنے سے پہلے ہی ان کی گردن خفیف سی

بزم منشور کے جلسے سے خطاب کر رہے ہیں

تیزی سے اثبات میں ہلنے لگتی ہے۔ اگر انھیں کسی بات سے اختلاف ہو تو گفتگو کرنے والے کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ان کی گردن تیزی سے انکار میں ہلنے لگتی ہے۔ اور آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ بات چیت کرتے وقت عموماً ان کے پتلے پتلے ہونٹ تیزی سے حرکت کرتے بلکہ تھرتھراتے ہیں۔ جملہ صرف اس حد تک ادا کرتے ہیں کہ مخاطب بات سمجھ جائے اور اگر مخاطب بات جلد سمجھنے والا ہو تو جملے کو ادھورا ہی چھوڑ کر اگلے جملے کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خیالات جس تیزی سے ان کے ذہن میں آتے ہیں زبان ان کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ مزدور کارکنوں کے درمیان عموماً خوش و خرم رہتے ہیں۔ بھرپور قہقہے لگاتے ہیں۔ ساتھیوں کو "میرے راجے" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش ہے کہ جو شخص ایک بار ان سے ملتا ہے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ میں نے ان کے بعض زبردست مخالفین کو دیکھا ہے کہ طفیل صاحب کے سامنے جا کر بات کرتے ہوئے ان کی آواز حلق میں اٹک جاتی ہے اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ یہ واضح کر دوں کہ یہ مخالفین دراصل مزدور تحریک اور ترقی پسند عوامی تحریک کے مخالف ہیں جو اپنی گھٹیا ذہنیت کی بنا پر طفیل صاحب کے ذاتی مخالف بن گئے ہیں۔

طفیل صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بار پھر میری نظریں ماؤزے تنگ کے ریلیکا پر جا کر جم گئیں۔ میں نے اس ریلیکا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے پوچھا "طفیل صاحب آپ ماؤزے تنگ سے کافی متاثر معلوم ہوتے ہیں؟" فرمایا "ہاں، یہ ریلیکا مجھے اپنے دورۂ چین کے دوران سول ایوی ایشن آف چائنا کی جانب سے پیش کیا گیا تھا۔ چیئرمین ماؤزے تنگ آج صرف چینی عوام کے رہنما نہیں ہیں بلکہ دنیا بھر کی عوام کی انقلابی جدوجہد کی ایک علامت بن چکے ہیں۔ ماؤ کی زیر قیادت چین نے سترہ اٹھارہ سال کے عرصے میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی ہے اور جہاں تک ماؤ کے نظریات اور انکی فکر کا تعلق ہے اس وقت ان کی سوچ دنیا بھر کے حریت پسندوں کی رہنمائی کر رہی ہے۔ دنیا بھر کا پرولتاری طبقہ اپنے اپنے ملک سے استحصال کا خاتمہ کرنے کیلئے انقلابی جدوجہد میں ماؤ کی فکر کو مشعل راہ بنا رہا ہے۔ ماؤزے تنگ نے عوامی جمہوری انقلاب آنے کے بعد پرولتاریہ کی حکمرانی برقرار رکھنے کا فلسفہ اور طریقہ کار پیش کیا اور اس طرح جدید ترمیم پسندی کی بیخ کنی کی ہے جو پرولتاری انقلاب کو سرمایہ داری کی راہ پر واپس لے جاتی ہے اور سامراج سے گٹھ جوڑ کر کے عوامی تحریکوں کو کچلتی ہے۔ چیئرمین ماؤ نے اپنے دیس سے سامراج کی محکومانہ معیشت کو ختم کر کے ایک ایسی معیشت کی داغ بیل ڈالی ہے جس میں بھوک، افلاس، جہالت، بیروزگاری، عصمت فروشی، رشوت ستانی اور استحصال کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا ہے، آج کا چین دنیا بھر کے مظلوم عوام کی ہمدردی اور عملی معاونت کا مرکز ہے اور یہ سب کچھ ماؤ کی تابناک قیادت کی بنا پر ممکن ہو سکا ہے۔"

اس کے بعد موضوع پر آتے ہوئے میں نے کہا "طفیل صاحب کچھ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیے"۔ کہنے لگے: "پیدائش سے آج تک کی خاص خاص باتیں بتاتا ہوں۔ تفصیل تو اگر کبھی موقع ہوا تو پھر دیکھی جائے گی۔ فی الحال موٹی موٹی باتیں پیش کر رہا ہوں"۔

میں کاغذ اور قلم سنبھال کر بیٹھ گیا اور انہوں نے بتانا شروع کیا — "میں جنوری سنہ ۱۹۲۸ء میں یوپی کے ضلع بلند شہر کے قصبہ ڈبائی میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن لاڈ پیار میں گزر رہا تھا کہ جب میں نو سال کا ہوا تو والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ہماری والدہ نے انتہائی صبر و ہمت سے کام لیا اور معاشرے کے تمام دکھ درد اور ناساعد حالات کا سامنا کرتے ہوئے ہماری تعلیم پر خاص توجہ دی۔ تعلیم کی ہی غرض سے مجھے علیگڑھ جانا پڑا جہاں میں نے ایک بالکل ہی نئی زندگی دیکھی۔ علیگڑھ سیاسی تحریکوں کا مرکز تھا۔ میں نے قائداعظم کی شخصیت میں ایک خاص کشش

حب الوطنی کا تقاضہ ہے کہ چین سے مستحکم دوستی کا رشتہ استوار کیا جائے۔

محسوس کی اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر خوب کام کیا۔ جب میں بی اے میں پہنچا تو اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر انگریز ڈپٹی کمشنر مورکسن کی نگاہوں میں معتوب ہوا اور ہمیشہ کے لئے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ لیکن بعد میں کچھ با اثر لوگوں کی کوششوں سے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی اور تب میں نے ۱۹۴۶ء میں امتیازی نمبروں سے بی اے پاس کیا۔ سب سے بڑی اولاد ہونے کی بنا پر میری ذمہ داریاں زیادہ تھیں چنانچہ گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے دہلی جا کر ملازمت کر لی۔ اس طرح ایک سرگرم طالب علم نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پچھتر روپے ماہوار کی کلرکی سے کیا۔ دہلی میں بھی سیاست کا بازار گرم تھا۔ ملک کی تقسیم یقینی ہو چکی تھی مگر اس وقت مجھے سیاست سے زیادہ اپنے گھر اور چھوٹے بھائی بہنوں کے مستقبل کی فکر تھی چنانچہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی سرزمین دیکھنے کے لئے میں اپنی والدہ اور اہل خاندان کو وہیں چھوڑ کر کراچی چلا آیا۔ اسی عرصے میں فسادات پھوٹ پڑے۔ میرے تمام گھر والے دہلی کے فساد زدہ علاقوں میں گھر گئے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح ..." آخری جملہ کہتے کہتے طفیل صاحب اچانک رک گئے۔ کچھ دیر بعد "یہ داستان بڑی طویل اور انتہائی تکلیف دہ ہے کہ وہ لوگ کس طرح کراچی آئے۔ یہاں ایک عزیز نے ہمیں اپنے ہاں جگہ دے دی۔ اس وقت میری تنخواہ ۸۹ روپے تھی۔ تقسیم ملک کے وقت جن حالات سے ہم لوگ گزرے اور اس کے بعد [illegible] پاکستان عروس البلاد کراچی میں ہم نے جو دکھ اٹھائے اس کے نتیجے میں والدہ اور بہن کو ٹی بی ہو گئی۔ بہرحال وہ دور گزر گیا ہے لیکن اس دور میں جو کانٹے میرے سینے میں گڑے تھے ان کی چبھن ابھی تک باقی ہے۔ جب میں علی گڑھ مسلم لیگ میں کام کرتا تھا تو سمجھتا تھا کہ علامہ اقبال اور قائداعظم کے کہنے کے مطابق پاکستان میں اسلامی سوشلزم

کا نظام رائج ہوگا۔ جہاں افلاس دکھ اور بھوک کے بھیانک بھوت عوام کے سروں پر نہیں منڈلائیں گے۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان کے بارے میں وہ تمام سہانے خواب سیاستدانوں کی مصلحتوں کے ہتھوڑوں نے چکنا چور کر دیئے ہیں۔ احسان کا کرچیوں ذہن میں چبھن پیدا کر رہی ہیں۔ جوں جوں دن گزرتے گئے حالات بہتر ہونے کی امید بھی ختم ہوتی گئیں۔ دوسری طرف میری خانگی پریشانیاں تھیں۔ بیوہ ماں اور بہن کے نے وہ داری تھی۔ بھائی کی تعلیم کا بندوبست نہ کر سکا تھا۔ کھانے اور پہننے کا تو کچھ پوچھئے نہیں۔ بس دن بھر کی مشقت تھی اور گھر والوں کے دکھ اور آلام۔ میرے دل و دماغ چھلنی ہوتے جا رہے تھے کہ اسی زمانہ میں مجھے اورینٹ ایرویز میں ایک سو چھبیس روپے ماہانہ کی ملازمت مل گئی۔ مجھے انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں لگایا گیا جہاں میں نے مزدوروں کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا اور معاشرے کا تضاد واضح شکل میں میرے سامنے آیا اور میں نے مزدور تحریک میں کام کرنے کا ارادہ کیا۔ عین اسی زمانے میں جب میں یہ سمجھنے لگا کہ تنخواہ بڑھ جانے کے نتیجے میں اب اپنی والدہ کو بہتر زندگی دے سکوں گا اور ان کی کچھ خدمت کر سکوں گا۔ وہ ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ جہاں اور دکھ سہے تھے یہ دکھ بھی کسی نہ کسی طرح سہہ لیا گیا۔ انہی دنوں [illegible]ء میں اورینٹ ایرویز کے مزدوروں نے اورینٹ ایرویز ورکرز یونین کی زیرِ قیادت اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہڑتال کر دی۔ اس ہڑتال کو اورینٹ کے منتظمین نے شہر کی انتظامیہ کی مدد اور اپنی قوت و وسائل کے بل بوتے پر ناکام بنا دیا۔ ہڑتال کرنے والوں کو نوکری سے نکال دیا گیا بعد میں ان کی ملازمت تو بحال کر دی گئی مگر ان کو ہڑتال کے ۳۲ دنوں کی تنخواہ نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس ہڑتال کے دوران کام کرنے والوں کو خصوصی بونس دیا گیا اور یونین کو توڑ دیا گیا۔ ان واقعات اور اس کھلی بے انصافی نے میرے ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ایک طرف تو یہ اطمینان تھا کہ مزدور جدوجہد کر کے اپنے حقوق منوانے کے لئے کمربستہ ہیں اور دوسری طرف پاکستان کا ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ یا گیردار طبقے گٹھ جوڑ کر کے پوری قوت کے ساتھ مزدوروں کی جدوجہد کو ناکام بنانے کے درپے ہے۔ یہی وہ شعور تھا جس کی مدد سے آگے چل کر ۱۹۵۱ء میں ہم نے کریڈٹ سوسائٹی قائم کی۔ اسے ایک باقاعدہ ٹریڈ یونین کی شکل دی۔ یونین بنانے میں ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کارکنوں کی ایک ایک ممبر بنانے کے لئے لوگوں کے گھر گھر جانا پڑتا تھا کیونکہ پچھلی ہڑتال کی وجہ سے ساتھیوں میں خوف و ہراس باقی تھا اور وہ ڈرتے تھے کہ انتظامیہ نے یونین بنانے پر جو پابندی لگا رکھی ہے اسے توڑنے سے ان کے روزگار پر نہ بن جائے بہرحال یونین قائم کی گئی اور مجھ کو یونین کا سیکرٹری منتخب کیا گیا اور ہم نے مزدور ساتھیوں کے مطالبات کی خاطر کرکے یونین سطح پر جدوجہد شروع کر دی۔ تقریباً چار سال تک

پی آئی اے مزدور ایئر مارشل نور خان صاحب کے کمانڈر انچیف پاکستان ایئر فورس مقرر ہونے پر ان کا استقبال کر رہے ہیں

تحریک کے لئے جدوجہد دن رات جاری رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۴ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے آئین منسوخ کر دیا اور جمہوریت کو پیروں تلے روند کر اندھا دھند گرفتاریاں شروع کیں ۱۸ مئی ۱۹۵۴ء کو مجھے اور اقبال علوی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں نے ہڑتالیں کرائیں، محلہ کمیٹیوں میں کام کیا اور یہ کہ میں کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ ان الزامات کی پوچھ گچھ INTERROGATION کرنے کے لئے مجھے پندرہ دن تک حوالات میں رکھا گیا۔ الزامات کھوکھلے تھے چنانچہ چار پانچ ماہ بعد مجھے رہا کر دیا گیا۔ اور چونکہ مجھے اورینٹ کے مزدوروں میں کافی مقبولیت حاصل تھی اس لئے انتظامیہ مجھے نوکری پر بحال کرنے پر مجبور ہوئی۔

۱۹۵۵ء میں پی آئی اے قائم ہوئی تو اورینٹ کو اس میں ضم کر دیا گیا۔ انتظامیہ بدل گئی۔ اس سے ہمیں اس بات کی توقع پیدا ہوئی کہ قومی ائرلائن کی نئی انتظامیہ شاید ہمارے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ دے مگر افسوس کہ ہماری تمام توقعات غلط ثابت ہوئیں اور نوکر شاہی ذہنیت رکھنے والی انتظامیہ نے مسائل حل کرنے کے بجائے اور الجھن پیدا کر دیں۔ مجبور ہو کر ہم نے نومبر ۱۹۵۵ء میں نصف گھنٹے کی علامتی ہڑتال کی جس کے نتیجے میں مجھے اور ادیب احمد خاں کو گرفتار کر کے ہمارا انٹروگیشن کیا گیا اور اس کے بعد جیل بھیج دیا گیا اور مارچ ۱۹۵۶ء میں رہا کیا گیا۔ مگر ہم اپنے موقف پر قائم رہے۔ انتظامیہ سے اپنا نکتہ نظر تسلیم کروایا۔ نتیجتاً انگریز جنرل منیجر کے چہ مجبور کو برطرف کر کے انگلینڈ واپس کر دیا گیا۔ پھر ہم نے نئے سرے سے نئے حالات کے تحت انتظامیہ سے گفت و شنید اور ۱۹۵۷ء میں ایک بہت اچھا معاہدہ انتظامیہ کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے اگلے سال ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء لگ گیا۔

طفیل صاحب نے یہیں تک واقعات بیان کئے تھے کہ چائے آ گئی اور سلسلۂ گفتگو ٹوٹ گیا۔ میں چائے پینے کے دوران سوچ رہا تھا کہ یہ شخص جو بار بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا ہے۔ جو لڑکپن سے جوانی تک سکھ کے نام سے بھی آشنا نہیں رہا جو آج بھی ذاتی چھت کے سائے سے محروم ہے کس یقین اور کس اعتماد کے ساتھ پاکستانی عوام کے لئے ایک روشن مستقبل کی باتیں کرتا ہے۔ اس نے جدوجہد میں اپنی جوانی گزار دی اور اب اس کے بالوں پر پھیلی ہوئی چاندی دوڑنے لگی ہے مگر اس کے ذہن سے نکلنے والی چاندی جیسی اجلی کرنیں ماند ہونے کے بجائے اور بھی تابناک ہو گئی ہیں۔ یقین آنکھوں سے چھلکا پڑتا ہے، اعتماد کشادہ پیشانی سے مترشح ہے، عزم باتوں سے جھلکتا ہے کہ خواہ کچھ ہو جائے راستے میں زنجیروں اور سلاخوں کی کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ آئیں، مخالفت کے کتنے ہی پہاڑ کیوں نہ کھڑے ہوں وہ پاکستان کے مزدوروں کی رہنمائی میں عوامی جمہوریت کی منزل تک لے جانے سے قدم پیچھے نہ ہٹائے گا۔

چائے ختم ہونے کے بعد میں نے سلسلۂ گفتگو کا دوبارہ آغاز کیا: "مارشل لا اور اس کے بعد حالات کی طرف آئیے!"

"ہاں!" طفیل صاحب نے بات شروع کی۔

"۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جس وقت ملک میں مارشل لا نافذ ہوا تھا۔ میں شدید بیمار تھا۔ پانچ چھ ماہ کی اس طویل بیماری سے میرے بچنے کی بھی کوئی امید نہ رہی تھی۔ لیکن شاید ابھی دنیا میں مجھے کچھ کام کرنا باقی تھا اس لئے زندہ رہ گیا اس دور میں عوامی رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریاں بڑے پیمانے پر کی جا رہی تھیں غالباً میری شدید علالت کی بنا پر اس وقت مجھے گرفتار نہ کیا گیا حکام نے سوچا ہوگا کہ پکڑنے کی کیا ضرورت ہے اس کا قصہ تو یونہی تمام ہو رہا ہے۔ بہر حال اسی زمانہ میں مارشل لا حکومت نے پی آئی اے کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک پروبنگ کمیٹی ——— (PROBING COMMITTEE) قائم کی جس کے چیئرمین پاکستان ائرفورس کے اس وقت کے کمانڈر انچیف ائرمارشل اصغر خاں صاحب تھے، اور اراکین میں پاکستان ائرفورس کے موجودہ کمانڈر انچیف ائرمارشل نور خاں صاحب جو اس وقت ائرکموڈور تھے، سیکریٹری وزارت دفاع، سیکریٹری وزارت مالیات اور دوسرے حضرات شامل تھے پروبنگ کمیٹی نے گفتگو کے لئے مجھے بھی بلایا۔ مجھ میں بیماری کی وجہ سے چلنے کی بھی سکت نہ تھی اس کے باوجود معاملے کی اہمیت کے پیش نظر میں پی آئی اے بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ کر میٹنگ میں شرکت کے لئے پہونچ گیا دوران گفتگو میں مختلف مسائل پر بحث ہوئی جن میں پی آئی اے کی خامیوں اور ان کے دور کرنے کے ذرائع، یونین اور انتظامیہ کے تعلقات اور میری پچھلی گرفتاریوں کے مسائل شامل تھے اس تفصیل اور سیر حاصل گفتگو نے ایک دوسرے کے نکتہ نظر کو سمجھنے اور سمجھانے میں بے حد مدد دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مارشل لا کے تحت یونین میں کچھ بھی تبدیلیاں کی جا سکتی تھیں اور کوئی بھی کارروائی روا رکھی جا سکتی تھی۔ لیکن

"صحیح جمہوریت یہ ہے جس میں عوامی تحریک مزدور طبقے کی رہنمائی میں آگے بڑھے"

مذکورہ بالا گفتگو کے بعد پروبنگ کمیٹی نے یہ محسوس کر لیا کہ پی آئی اے کی یونین کے کسی عہدیدار کو گرفتار کرنا یا ملازمت سے نکالنا ملک کے مفاد میں نہ ہوگا۔ پی آئی اے کی بہتر کارکردگی کے لئے ضروری ہے کہ یونین کو مزید کام کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں اس گفتگو کے بعد ائرکموڈور نور خاں صاحب کو پی آئی اے کا مینیجنگ ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ ان سے بھی مختلف مسائل پر ہماری بات چیت ہوئی اور ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہمارے قومی موقف کی تائید کرتے ہیں وہ اس قومی ائرلائن کو آجر و مزدور کے درمیان تعلقات کے ایک نئے انداز کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ اسی زمانے میں یعنی اگست ۱۹۵۹ء میں ہمارے چند ساتھیوں کو جن میں ایس ایم صادق شامل تھے گرفتار کیا گیا اور ان سے پوچھ گچھ کی گئی۔ اس پوچھ گچھ کا بھی وہی حشر ہوا جو ہمارے ساتھ ہو چکا تھا اور آخر کار صادق وغیرہ کو رہا کر دیا گیا۔ بہرحال نور خاں صاحب کے صحت مند طرز عمل کی بناء پر یونین اور انتظامیہ کے درمیان اصول اتحاد کی فضا قائم ہوئی اور بہتر تعلقات پیدا ہوئے اسی

یونین کے عہدیدار صدر پی آئی اے جناب ایئر مارشل اصغر خان سے تبادلۂ خیال کر رہے ہیں

دوران ۱۹۵۹ء کے اواخر میں امریکی صدر جنرل آئزن ہاور پاکستان کے دورے پر تشریف لا رہے تھے۔ پاکستان کی رجعت پسند طاقتوں اور سی آئی ڈی نے محسوس کیا کہ شاید مارشل لا کے دوران بھی ترقی پسند طاقتیں اتنی مضبوط ہیں کہ آئزن ہاور کے طیارے کو پاکستان کی سرزمین پر اسی طرح نہ اترنے دیں جس طرح جاپان کے عوام نے اس کے طیارے کا رخ جاپان کی سرزمین پر اترنے سے پہلے ہی واپس پھیر دیا تھا۔ چنانچہ اس اندیشے کے تحت کراچی کے طلبا، مزدوروں اور عوامی کارکنوں کی ایک بڑی کھیپ کو رات کے گیارہ بجے سے صبح کے پانچ بجے تک گرفتار کر کے کراچی سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا تاکہ امریکی سامراج کے سربراہ جنرل آئزن ہاور اپنے تمام تر مکروہ سامراجی عزائم کے ساتھ پاک سرزمین پر دندناتے پھریں۔ گرفتاریوں کے اس سلسلے میں ۱۹۵۹ء کو مجھے بھی گرفتار کیا گیا۔ رات کے ۱۲ بجے نورخاں صاحب کو میری گرفتاری کا علم ہوا۔ تو انہوں نے وزارت داخلہ کے متعلقہ افسران سے بات کی اور ان پر واضح کیا کہ ان کو بتائے بغیر میری گرفتاری ایک غلط اقدام ہے۔ ہمارا وارنٹ گرفتاری ایک ماہ کے لئے تھا مگر ہمیں پانچ دن کی نظربندی کے بعد مجبور ہو کر رہا کر دیا گیا۔ ہماری رہائی کو سی آئی ڈی کے لوگ اپنی شکست سمجھتے تھے وہ چاہتے تھے کہ مجھے مزدور تحریک کے پلیٹ فارم سے ہٹا دیں اور یونین کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کر دیں وہ جانتے تھے کہ یہ ڈیفنس ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ پاکستان بھر کی مزدور تحریک کی راہ ائ

کر سکتی ہے اور اس یونین کا باشعور قیادت کے ساتھ ترقی کرنا خطرناک بات ہوگی اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں مارشل لا حکومت نے ایک بار پھر ترقی پسند طاقتوں پر بھرپور حملہ کیا۔ میرے ایک دوست اور ساتھی حسن ناصر روپوش تھے، حکومت نے ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے اور ان کے علاوہ طلبا اور سیاسی اور مزدور کارکنوں کو گرفتار کیا جن کو قید کے دوران سخت ترین انسانیت سوز اور وحشیانہ اذیتیں دی گئیں۔ ان کی گرفتاری کے بعد ۸ ستمبر ۱۹۶۰ء کی دوپہر کو مجھے بھی دفتر سے گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس اور سی آئی ڈی نے بڑی چالاکی کے ساتھ یہ موقع اس وقت تلاش کیا جب نورخاں صاحب دورے پر لندن گئے ہوئے تھے۔ مجھے ایک ماہ تک پولیس نے ایمرجنسی سینٹر میں رکھ کر انتہائی غیر مہذب، خطرناک اور تکلیف دہ میں بازپرس (INTERROGATION) کی گئی۔ نورخاں صاحب دورۂ لندن سے واپس آئے تو انہوں نے پی آئی اے کے چیف میڈیکل آفیسر کو مجھے دیکھنے کے لئے بھیجا۔ مجھے اس دوران اتنی سخت تکلیفیں دی گئی تھیں کہ بعض اوقات مجھے خود اپنی زندگی ختم ہوتی نظر آتی تھی اس سارے ظلم و تشدد کا سبب سی آئی ڈی کا ایک من گھڑت افسانہ تھا۔ جس میں بتایا تھا کہ اس زمانے میں روس اور پاکستان کے درمیان تیل کا ایک معاہدہ ہوا تھا۔ سی آئی ڈی اور امریکی سی آئی اے کے ایجنٹوں کا خیال تھا کہ اس پردۂ زنگاری میں کمیونسٹ پارٹی ہے اور اس کا تعلق کچھ اس

قسم کا ہے جس سے مارشل لا حکومت کو خطرہ ہے حالانکہ سراسر ان کا وہم تھا مگر اپنے آقاؤں کو خوش رکھنے کے لئے وہ ہم پر ظلم و تشدد کے ذریعے اقرار کروانا چاہتے تھے تاکہ پھر کھلم کھلا مقدمہ چلا کر ہمارا بھی وہی حشر کریں جو رجعت پرست طاقتیں حریت پسندوں کے ساتھ ہمیشہ کرتی آئی ہیں۔ اسی قسم کا ظلم انہوں نے میرے دوست اور ساتھی حسن ناصر پر روا رکھا۔ انہیں لاہور کے شاہی قلعے میں تشدد کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا گیا۔

نظر بندی کے دوران نور خان صاحب مجھ سے لاک اپ میں ملنے گئے۔ میں نے اپنی بیماری کی وجہ پر ان سے درخواست کی کہ مجھے جیل میں منتقل کر دیا جائے۔ ادھر سی آئی ڈی والے بھی اپنے ترکش کے تمام تیر مجھ پر خالی کر چکے تھے چنانچہ مجھے جیل بھیج دیا گیا اور میری معیاد قید میں چھ ماہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ حالانکہ دیگر کافی لوگوں کو رہا کر دیا گیا تھا۔

ابھی میں جیل ہی میں تھا کہ مجھے پی آئی اے کی نوکری سے برطرفی کا نوٹس مل گیا۔ میرے خلاف نہ تو کوئی انکوائری ہوئی تھی نہ جرم ثابت ہوا تھا اس حالت میں میری برطرفی کا کوئی جواز نہ تھا۔ لیکن پی آئی اے کی سروس کوڈ میں ایک دفعہ کا اندراج کر کے میری برطرفی کی راہ نکال لی گئی۔ مجھے یقین تھا کہ پی آئی اے کی یونین کی مضبوطی اور مزدوروں کے شعور کی بنا پر جیل کی کوٹھری میں برطرفی کا پروانہ حاصل کرنے کے باوجود میں پی آئی اے کی ملازمت میں واپس جاؤں گا۔ میرے رفقا اور احباب میرے اس خیال کو اس وقت محض دیوانے کی بڑ خیال کرتے تھے۔

آخر کار مئی ۱۹۶۱ء میں مجھے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری سے نکال کر وطن کی ان فضاؤں میں بھیج دیا گیا جن پر اس وقت مارشل لا کا اندھیرا اور خوف و دہشت کی گھٹن طاری تھی۔ رہائی کے وقت میرے محنت کش ساتھیوں نے خلوص اور جذبات کی پوری شدت کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ ان کا جوش ابلا پڑتا تھا ان کی دلی حسرت کی رنگ ان کے چہروں پر جھلک رہی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں سے ملنے کے لئے ایئرپورٹ اور بکنگ آفس کے تمام دفاتر میں گیا۔ مزدور ساتھیوں نے میرا جس طرح خیر مقدم کیا اس سے انتظامیہ، سی آئی ڈی اور پولیس افسران پر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں دوبارہ پی آئی اے کی حدود میں داخل نہ ہوں۔ اس حکم کے بعد میں ایئرپورٹ پر یونین آفس میں جاتا رہا اور متعلقہ کاموں کے لئے اپنے مزدور ساتھیوں سے ان کی بستیوں میں جا کر ملتا رہا۔ میرے ساتھیوں نے اپنی پرجوش محبت ظاہر کرنے کے لئے وائی ایم سی اے میں مجھے ایک زبردست استقبالیہ دیا۔ ان کے جذبات اور احساسات دیکھ کر میں نے اپنا عہد تازہ کیا کہ مزدور تحریک کے لئے اپنی جان تک کی قربانی سے دریغ نہ کروں گا۔ استقبالیہ میں سی آئی ڈی کے حضرات بھی منڈلا رہے تھے۔ اس بات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ حکومت چاہتی ہے کہ میں ٹریڈ یونین کے منظر سے ہٹ جاؤں ورنہ مجھے پھر گرفتار کر لیا جائے گا کیونکہ میرا ایک سال کا وارنٹ دستخط ہونے کے لئے کمشنر آفس میں پڑا ہے میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

کہ ایک بار پھر خود کو قید و بند کی آزمائشوں کے لئے پیش کر دوں لیکن اپنے مقصد سے غداری نہ کروں۔ چنانچہ رہائی کے صرف بائیس دن بعد جون ۱۹۶۱ء کی ایک شام کو مجھے اور اقبال علوی کو ایئرپورٹ سے گرفتار کر کے ایک سال کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ چند ماہ جیل میں گزارنے کے بعد میں نے پیرول پر رہائی کی درخواست دی اس لئے کہ میری چھوٹی بہن کا ایک خطرناک آپریشن ہونے والا تھا۔ ایک روز مجھ کو گاڑی سے جیل کے گیٹ بلا لیا گیا۔ میں سمجھا کہ شاید حکومت رحم دل ہو گئی ہے اور اس بات پر تیار ہے کہ میں اندیشہ ناک آپریشن کے نازک مرحلے پر اپنی بہن کی آنکھوں کے سامنے رہ سکوں۔ یہ میرا خیال خام تھا۔ ہوا کچھ اور ہی! ڈی ایس پی اور انسپکٹر صاحبان مجھے "پوچھ گچھ" (INTERROGATION) کے لئے پولیس ہیڈ کوارٹر لے گئے۔ میں نے کہا کہ ان گنت مرتبہ تو آپ مجھ سے "پوچھ گچھ" کر چکے ہیں اب نظر بندی کے دوران میں نے کون سا ایسا کام کیا ہے جو آپ کو پھر اس کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ انہوں نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ شہید حسن ناصر نے جو بیانات دیئے ہیں اور ان سے جو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ان کی بنا پر پوچھ گچھ ضروری ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ بکواس ہے اور یہ لوگ معاملے کو الجھانے اور طول دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بے سروپا ذہنی باتوں کا اعتراف کروانے کے لئے اپنی زبان کی پوری طاقت مجھ پر صرف کر ڈالی۔ قوت ارادی توڑنے دھمکانے کے لئے دو افسران کے ہمراہ مجھ کو ایک کمرے میں پوچھ گچھ کے لئے بھیج دیا گیا ان افسران نے کہا کہ چار دن کے بعد لانا اور اس کا حلیہ بگاڑ دینا تاکہ اس کا دماغ ٹھیک ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ میں حراست میں تھا زندگی موت سے دوچار ہو سکتی تھی۔ ذہن نے ایک پھریری لی اور دل نے کہا کہ وطن عزیز کے لئے اور دل نے بھی جان کی بازی لگائی ہے میں بھی ان کے نقش قدم پر چلوں گا۔ پھر اس کے بعد آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں نے ان کے ہر حربے کو کس طرح ناکام بنایا ہوگا اور جب وہ اپنی شرمناک کوششوں میں ناکام ہو گئے تو ۔۔۔ انہوں نے مجھے لاک اپ میں بھیج دیا جہاں مجھے دن رات جگانے کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ ادھر مجھ پر مہربانیاں ہو رہی تھیں اور ادھر میرے گھر والے جو بہن کے آپریشن کی بنا پر مصروف اور پریشان تھے وہ اس بات سے لاعلم تھے کہ مجھے جیل سے نکال کر لاک اپ میں بند کر دیا گیا ہے۔ گھر والے

> "روس کے ترمیم پسند حکمران ٹولے امریکی سامراج سے اطاعت پرستانہ گٹھ جوڑ کر چکے ہیں"

رشتے بھی عجیب ہوا کرتے ہیں گھر والوں کو کسی نہ کسی طرح یہ احساس ہو گیا کہ میں جیل میں نہیں ہوں چنانچہ انہوں نے بے چین اور مضطرب ہو کر پوچھ گچھ شروع کی تو سی آئی ڈی والے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ میں کہاں ہوں۔ اس عرصے میں جسمانی طور پر میرا انسانی حلیہ بگاڑ دیا گیا تھا۔ مگر آدرش کی آگ میں جل کر ضمیر کی جوت اور روشنی اور تیز ہو گئی تھی اور مجھے مزید تقویت دے رہی تھی کہ ان امتحانوں میں بھی پورا اتروں جو آگے آنے والے ہیں۔

مجھے ہر قسم کی دھمکیاں دی گئیں کہ تمہیں اذیتیں پہنچا کر مار ڈالا جائے گا

کمانڈر انچیف کی حیثیت سے ہو گیا اور ان کی جگہ ائیر مارشل اصغر خاں صاحب نے پی آئی اے کے صدر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا۔ اصغر خاں صاحب سے ملاقات ہونے پر ہم نے ان کو بھی اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا اور اصولی اتحاد کے ضمن میں اپنی پالیسی کی وضاحت کی۔ اسی دوران میں ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ چھڑ گئی اس جنگ نے ہمارے قومی نقطۂ نظر کی صداقت پوری طرح ثابت کر دی۔"

"معاف کیجئے۔" میں نے کہا "قطع کلام ہوتا ہے کیا آپ یہاں یہ واضح کر دیں گے کہ آپ کا قومی نظریہ کیا تھا جس کی صداقت ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ثابت ہوئی؟"

"۶۵ء کی جنگ نے یہ ثابت کر دیا کہ بین الاقوامی سطح پر کون سے ممالک پاکستانی عوام کے دوست اور کون سے دشمن ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس جنگ نے ان تمام معاہدوں کی بھی پول کھول دی جو پاکستان کی موجودہ اور سابقہ حکومتوں نے سامراجی طاقتوں سے کئے تھے۔ عوامی جمہوریہ چین نے جس جوانمردی سے اصولی موقف اختیار کر کے پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا اس نے یہ ثابت کر دیا کہ آج جمہوریہ چین ہی وہ عظیم طاقت ہے جو کسی بھی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر اصولی پالیسی پر کاربند رہتے ہوئے کچلے ہوئے عوام کی پشت پناہی کر سکتی ہے۔ یہ اسی پالیسی کا اظہار تھا کہ مذکورہ جنگ کے دوران چین کے وزیر اعظم مسٹر چو این لائی نے اعلان کیا تھا کہ اگر ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو اسے چین پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ جب میں نے ۱۹۶۶ء میں چین کا دورہ کیا تو وہاں کے ذمہ دار لوگوں سے

> جنگیں اس وقت ختم ہو سکتی ہیں، جب امریکی سامراج کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں اور سر کچل دیا جائے"

اس بات کی وضاحت چاہی کہ آیا ان کا یہ اعلان حقیقت پر مبنی تھا اور کیا چین ان تمام خطرات کے لئے بھی تیار تھا جو بھارت کے مشرقی پاکستان پر حملے کی صورت میں چین کے جنگ میں شریک ہونے پر پیش آتے۔ انہوں نے بتایا کہ اس کا اعلان یہ جانتے ہوئے کیا گیا تھا کہ سامراجی اور ترمیم پسند طاقتیں مشرقی بعید میں اپنے عزائم ناکام ہوتے دیکھ کر ضرور مزاحمت کریں گی۔ اور ایک بڑی جنگ یقینی ہو گی۔ مگر چین کی پالیسی اصول پسندی اور عوامی حقوق اور آزادی کے تحفظ اور بحالی کی پالیسی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کشمیر ویت نام اور اسی طرح ہر عوامی جدوجہد کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔

"آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی حکمران ٹولی بڑے جاگیرداروں اور اجارہ دار سرمایہ داروں پر مشتمل ہے اور اس کی پشت پناہی امریکی سامراجی اور روسی ترمیم پسند حکمران ٹولیاں کر رہی ہیں جبکہ یہ واضح موقف ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کو ایک بڑی طاقت بننے سے اور عوامی جدوجہد آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرنے سے روکا جائے کیونکہ چین کی اس پالیسی سے امریکی سامراج اور ترمیم پسند طاقتوں کی پول کھلتی ہے"

"عوامی جدوجہد آزادی کا ذکر آگیا ہے تو یہ بھی واضح کرتے چلیے کہ کیا آپ کے خیال میں کشمیری عوام کی آزادی کا مسئلہ باہمی گفت و شنید کے ذریعے حل ہو سکتا ہے؟"

"آپ کو معلوم ہے کہ اعلان تاشقند جو سترہ روزہ جنگ کے بعد وجود میں آیا تھا اس پر عوام کا کیا ردعمل تھا۔ یہ امریکہ اور روس کے درمیان گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھا۔ روسی ترمیم پسند حکمران ٹولی نے ماسکو کے وقار کی بنا پر فائدہ اٹھاتے ہوئے معاہدہ تاشقند کر کے امریکی سامراج کو مشرق بعید میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً سنبھالا دینے کے جرم کا ارتکاب کیا۔ یہ معاہدہ روس کی سرزمین پر اس لئے ہوا اور پاکستانی عوام کو کسی حد تک اس لئے دھوکا دے سکا کہ اس وقت پاکستانی عوام کی نظروں میں روس کا موجودہ گھناؤنا ترمیم پسند کردار واضح نہیں ہوا تھا اس جنگ سے پاکستانی عوام کے جذبات امریکی سامراج کے خلاف شدت سے بھڑکے ہوئے تھے جن کی بنا پر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ یہ معاہدہ امریکہ کی سرزمین پر ہو سکتا۔ پاکستانی عوام خوب سمجھتے تھے کہ بھارت نے امریکی سامراج کی شہ پر ہی پاکستان پر حملے کی جرات کی تھی کیونکہ امریکی سامراج یہ چاہتا تھا کہ پاکستان کو اس بات پر مجبور کر دے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ مل کر چین کے بڑھتے ہوئے عوامی ابھار کے سامنے دیوار بنے۔ یہ بات واضح ہے کہ پاکستان کی بہادر افواج اور نڈر عوام نے اس حملہ کا بے جگری سے مقابلہ کیا۔ پاک سرزمین کی حفاظت کی ورنہ شاید ۱۹۶۵ء کے شہیدوں کا خون رائیگاں جاتا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ کشمیر کا مسئلہ گفت و شنید کے ذریعے نہیں ہو سکتا اسی کی وجہ تھی کہ ہم نے مظاہروں اور جلسوں کے ذریعے اس معاہدے کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ اور اس کی سختی سے مخالفت کی۔ اعلان تاشقند ایک دھوکا تھا جس کی مخالفت پاکستان کے سابق وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے بھی کی اور پھر ان کے بعد کے وزیر خارجہ مسٹر شریف الدین پیرزادہ اور پوری حکومت نے بھی کسی نہ کسی شکل میں یہ محسوس کر لیا کہ اعلان تاشقند ایک دھوکا تھا۔ ہمارے نزدیک اعلان تاشقند پاکستانی اور کشمیری عوام کے ساتھ غداری ہے۔ اور مسئلہ کشمیر کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ سب سے پہلے خود پاکستان کے اندر عوامی جمہوریت قائم ہو تا کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام یہ محسوس کر سکیں کہ پاکستان کے ساتھ الحاق ان کے لئے فائدہ مند ہے۔ وہ تضاد جو مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان موجود ہے اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں عوامی حکومت اور عوامی فوج قائم ہو اور ہندوستان کی حکمران ٹولی مجبور ہو کر کشمیری عوام کو ان کا حق خود اختیاری دیدے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہم ہندوستان کی جاگیردارانہ اور اجارہ دار سرمایہ دارانہ حکومت کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام میں کوئی دشمنی پیدا کی جائے۔ جاگیردارانہ اور اجارہ دار سرمایہ دارانہ طاقتیں چاہے ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں وہ لازمی طور پر عوامی ابھار کی ہر شکل سے گھبراتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ معاہدہ تاشقند وجود میں آیا۔ ہندوستان کے صحیح عوامی نمائندوں نے ہندوستان کی حکمران ٹولی سے بارہا کہا ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے تنازعے کو عوامی طریقے اور حق خود اختیاری کی بنیادوں پر حل کرے

یہ مسئلہ نہ تو "مشترکہ دفاع" سے حل ہو سکتا ہے نہ امریکی سامراج اور روسی ترمیم پسندوں کی بھونڈی سازشوں سے حل ہو سکتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ ہند و پاک کی رجعت پرست طاقتیں، وہ خواہ حکومتوں کے اندر ہوں یا باہر کبھی بھی اس مسئلے کو عوامی جدوجہد کے ذریعے یعنی عوامی فوج بنا کر حل کرنا نہیں چاہتیں کیونکہ اس طرح انہیں آنے والے کل میں خود اپنی بھی موت نظر آتی ہے۔"

"آپ نے عوامی فوج کا ذکر چھیڑا ہے۔ آجکل بعض سیاسی لیڈر بلکہ بعض کیوں کہا جائے صاف کہنا چاہیئے کہ ایئر مارشل اصغر خاں بھی عوامی فوج کے قیام پر زور دے رہے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ کیا ملک میں عوامی فوج بنانے کے لئے حالات سازگار ہیں؟"

اس سوال پر طفیل صاحب چونک پڑے اور بیساختہ بول پڑے "ارے کیوں نہیں بھئی! حالات تو آج سے نہیں بیس سال سے سازگار ہیں۔ آخر ۱۹۴۷ء میں عوام نے ہی تو اپنا خون بہایا تھا، پھر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں غیر ملکی استبداد کے خلاف مسلح فوجوں کے ساتھ ساتھ عوام نے جس جانبازی کا مظاہرہ کیا وہ تو ہماری ملکی تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہے۔ ہمیں تو اس بات کا یقین ہے کہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۵ء کے شہید عوام کا خون رنگ لائے گا اور عوام تاریخ کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ اس وقت صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے سرمایہ دار ممالک میں عوامی افواج کے قیام کے لئے حالات تیار ہو چکے ہیں۔ اور یہ عوامی ابھار ہی تھا جس کی وجہ سے تین چار ماہ کے عرصے کے اندر صدر ایوب جیسے "مرد آہن" کو نرم ہونا پڑا۔ حالانکہ چند ماہ پیشتر کسی کو اس بات کا سان وگمان بھی نہ تھا۔ مشرق وسطیٰ میں "الفتح" کی تنظیم قائم ہو چکی ہے اسی طرح افریقہ اور لاطینی

چینی مزدور رہنماؤں کا وفد مزدوروں کے جلسے میں

امریکہ میں آزادی کی لہر دوڑ چکی ہے۔ یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ عوام اب مزدور طبقے کی رہنمائی میں مسلح جدوجہد کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں عوام دشمن طاقتیں شکست کھائیں گی۔ وہ دن دور نہیں ہے جب دنیا بھر کے اور خصوصاً پاکستان کے مزدور کسان اور کچلے ہوئے عوام اپنا حق لیں گے اور سرمایہ دار اور سامراجی طاقتوں کو ختم کر دیں گے۔ اس جدوجہد سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ ہر اس جگہ جہاں مسلح عوامی تحریک زور پکڑتی ہے امریکی سامراج اور روسی ترمیم پسند حکمران سمجھوتہ کر لیتے ہیں مگر عوام اتنے بیدار ہو چکے ہیں کہ اب ترمیم پسندوں کا ڈھونگ ننگا ہو جائے گا۔ پاکستانی عوام کو یہ بات ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ اس عالمی عوامی قافلے کا ایک حصہ ہیں جو اس وقت دنیا بھر میں پیشقدمی کر رہا ہے۔ پاکستانی عوام اس تحریک میں کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں انہوں نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں بیرونی استبداد کے مقابلے میں اپنی قوت اتحاد اور شعور کا مظاہرہ کیا تھا اور آج ۱۹۶۸-۶۹ء میں اندرونی استبداد کے خلاف انہوں نے فتح حاصل کی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ عوامی تحریک ایک نہ ایک دن عوامی حاکمیت اور عوامی جمہوریت کی منزل تک ضرور پہنچے گی اور یہ میرا یقین ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں۔"

"آج پاکستان میں عوامی تحریک جس زور شور سے ابھر رہی ہے کیا اس سے پہلے کسی دور میں آپ نے تحریک کی یہ شدت دیکھی تھی؟"

"ایسی شدت تو نہیں دیکھی کیونکہ اس وقت تو تحریک پورے مشرقی اور مغربی پاکستان میں پھیل چکی ہے البتہ اس سے پہلے بھی عوامی تحریک اکثر ابھرتی رہی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی کے طلباء کی تحریک پاکستان کی عوامی تحریکات میں اہم مقام رکھتی ہے۔ مزدور طبقے کے کارکن کی حیثیت سے میں نے اس تحریک میں آگے بڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ۸ جنوری کو طلباء پر پولیس نے بے تحاشہ فائرنگ کی تھی جس میں کئی طالبعلم ہلاک ہوئے تھے میں خود مرتے مرتے بچا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں آرام باغ میں عوامی لیگ کا ایک جلسہ ہو رہا تھا اس وقت عوامی طاقتوں کی رہنمائی عوامی لیگ کر رہی تھی اور رجعت پرست طاقتیں عوامی لیگ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔ چنانچہ آرام باغ کے جلسے میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے کارکنوں نے زبردست غنڈہ گردی کی اور اپنے خیال میں مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی لیکن کسی نے سچ کہا ہے جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔"

طفیل صاحب عوامی رہنماؤں کی وہ تحریریں جو انہوں نے آہنی سلاخوں کے پیچھے قلمبند کیں عوامی ادب کا ایک بیش بہا حصہ ہیں۔ کیا آپ نے بھی قید و بند کے ایام میں تاثرات کبھی قلمبند کئے؟

طفیل صاحب کے ہونٹ بھنچ گئے۔ لمحہ بھر کے لئے ان کی گردن اثبات میں ہلی پھر وہ خاموشی سے فرش کی جانب دیکھنے لگے۔ چند لمحے بعد اس خاموشی کو انہوں نے خود توڑا اور کہا۔ "ہاں ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء وغیرہ کے واقعات اور تاثرات جو میں نے خطوط کی شکل میں تحریر کئے تھے وہ مارشل لا لگنے کے بعد ۱۹۵۸ء کی خانہ تلاشی میں ضائع ہو گئے۔ اس کے بعد کے تاثرات ان خطوط کی شکل میں

ہیں جو میں نے جیل سے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک اپنے بھائی بہنوں کو لکھے تھے ان خطوں میں صرف تاثرات ہی نہیں ہیں بلکہ حالات کا تجزیہ، میرے عزائم، آمرانہ جور واستبداد سے نفرت کا اظہار اور اپنے مزدور ساتھیوں سے پیار سبھی کچھ موجود ہے۔ وقت آنے پر یہ خطوط منظر عام پر آئیں گے۔ شاید ان سے آپ کو میرے عزم اور مزدور طبقے سے پیار کا اندازہ ہو سکے۔ یہ شکر ہے کہ پچھلے تجربے کی روشنی میں یہ خطوط محفوظ رکھ لئے گئے ہیں۔"

"گرفتاری کے بعد آپ سے جیسے رحمانہ انداز میں" بازپرس" کی جاتی تھی اس سے حکام آخر جاننا کیا تھے؟"

"جاننا کیا تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم حکومت کے خلاف کسی قسم کی سازش کر رہے ہیں' یا ہمارا تعلق کسی غیر ملکی سفارت خانے سے ہے۔ اور پی آئی اے کی ایئر ہوسٹسوں اور پائلٹوں کے ذریعے دنیا بھر کی عوامی اور کمیونسٹ تحریکوں سے میرا رابطہ ہے۔ ہم سے اسی قسم کی مفروضہ باتیں قبلوانے کی غرض سے ہم پہ تشدد کیا جاتا تھا۔ بقول فیض ؎

"وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے"

کوئی ایسی بات ہوتی تو ہم اگلتے بھی ہم ترقی پسند عوامی تحریک کے حامی تھے اور ہیں۔ اس کا ہم نے ہمیشہ فخر سے اعتراف کیا اس کے سوا جتنی باتیں تھیں وہ حکومت اور رجعت پرست حلقوں کے اپنے خوف کی پیداوار تھیں۔ میرے علاوہ تحریک کے جو اور ساتھی گرفتار ہوتے تھے ان سے بھی یہی سوال کیا جاتا تھا کہ بتاؤ تمہارا تعلق کس کس سے ہے لیکن انتہائی بازپرس کے باوجود بھی انہیں اپنے مطلب کی کوئی بات بھی نہ مل سکی۔"

"کیا آپ کو غیر ممالک میں جا کر عوامی تحریکات کے مطالعے کا موقعہ ملا ہے؟"

"میں اتنے عرصے کے لئے تو باہر نہیں گیا کہ وہاں کی عوامی تحریکات کا تفصیلی مطالعہ کرتا البتہ ایک بار مجھے کارپوریشن کی بعض ذمہ داریاں لے کر حج کے زمانے میں سعودی عرب جانے کا شرف حاصل ہوا تھا اور ایک بار اسی طرح چین جانے کا اتفاق ہوا تھا۔"

"کیا آپ اپنے ان دوروں کے تاثرات بیان کریں گے؟"

"کیوں نہیں! میں ایک عرصے سے چین کے ثقافتی انقلاب اور وہاں ابھرتی ہوئی نئی عوامی سوچ کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میری بڑی پرانی خواہش تھی کہ اس سرزمین کو جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ جس زمانے میں ایئر مارشل اصغر خاں صاحب پی آئی اے کے صدر تھے انہوں نے مجھے اس بات کا موقعہ فراہم کیا۔ چین جا کر میں نے جو کچھ وہاں دیکھا اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے وہاں ایک الگ ہی دُنیا نظر آئی۔ ایک ایسی دُنیا جسے ذہن سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ ستر کروڑ عوام کا ایک سیلاب اُمڈتا نظر آتا تھا۔ جو اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ چینی عوام اپنے مسائل اپنے عظیم رہنما چیئرمین ماؤ کے نظریات اور ان کی ہدایات کے مطابق حل کرنے کے لئے چل پڑے ہیں اور چل رہے ہیں۔ چینی عوام اس بات کا بھی تہیہ کر چکے ہیں کہ وہ دُنیا کے مظلوم اور کچلے ہوئے عوام کی ہر طرح مدد کرنے کے لئے پوری طرح تُلے ہوئے ہیں۔ خواہ اس مقصد کے لئے انہیں خود اپنا خون ہی بہانا پڑ جائے۔ وہ چیئرمین ماؤ کی سرکردگی میں دُنیا بھر کے عوام کو لوٹ کھسوٹ، استحصال اور سامراجیت سے چھٹکارا دلانے کا عزم کر چکے ہیں۔ میں نے چینی عوام کے نظم و ضبط کا بھی ایک ناقابل یقین مظاہرہ دیکھا یکم اکتوبر کو، جو چین کا یوم آزادی ہے۔ پیکنگ میں ۲۵ لاکھ ریڈ گارڈ مجتمع ہوئے تھے۔ یہ ریڈ گارڈ آٹھ نو سال سے لیکر بیس بائیس سال تک کے لڑکوں لڑکیوں پر مشتمل تھے۔ نوعمر چینیوں کا یہ سیل بے پایاں ذرا سی بھی بے راہ روی کا شکار ہوئے بغیر جس طرح رواں دواں تھا اس کو ذہن یاد نہیں کر سکتا۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ تمام کے تمام ریڈ گارڈ موتیوں کی ایک ایک ذہن لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ چین کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ ان کا نظم و ضبط ان کا اتحاد اور ان کا شعور اس بات کی دلالت کرتے تھے۔ کہ پورے ستر کروڑ چینی عوام کو سوشلزم کی منزل کی طرف لے جائیں گے۔ چینی بچوں کے کھیل کود دوسری قوموں سے مختلف ہیں۔ صرف ان کے کھیلوں کو ہی دیکھ کر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ چینی عوام کسی بھی ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم سے ہراساں نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ چین میں میرا سترہ اٹھارہ روز کا قیام میرے لئے ایک تعلیم گاہ ثابت ہوا۔ میرے ذہن کے بہت سے جالے صاف ہو گئے اور منزل کا راستہ مجھے واضح طور پر نظر آنے لگا۔ مجھے وہاں عوامی تحریک کے خدوخال اور حکمت عملی کو سمجھنے میں مدد ملی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر میں چین نہ گیا ہوتا تو کئی سال میں بھی منزل کو اتنا صاف طور پر نہ دیکھ پاتا۔ پیکنگ "انقلابی جنگ کا میوزیم" دیکھ کر میرے ذہن کے گوشے روشن ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ کس طرح چین کے عوام نے مزدوروں کی سرکردگی میں بیس سال تک جدوجہد کرنے کے بعد تمام مغربی طاقتوں اور ان کے سردار امریکی سامراج کا تختہ اُلٹ دیا۔ حالانکہ جب تحریک شروع ہوئی تھی تو گنتی کے چند لوگ تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ سمجھ میں آیا کہ اگر عوام ایک بار انقلابی نظریے کو ٹھیک طرح سمجھ لیں اور مضبوطی سے کاربند رہیں تو یقیناً یقیناً وہ بڑی سے بڑی طاقت کا نہ صرف مقابلہ کر سکیں گے بلکہ اس کو بھرپور شکست بھی دے دیں گے۔ آنے والے کل میں چین بڑی طاقت بننے جا رہا ہے۔ وہ اپنے اور دنیا بھر کے حریت پسندوں کے تحفظ کے لئے ہر طرح لیس ہوگا۔ چینی عوام اپنے ہر ہر قدم سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انہوں نے فرسودہ روایتوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اور اب کم سے کم عرصے میں ایٹم اور ہائیڈروجن بم بنانے کے عظیم دور میں داخل ہو چکے ہیں۔"

"آپ فریضۂ حج ادا فرمانے میں بھی جا چکے ہیں۔ کیا آپ اس سلسلہ میں بھی اپنے تاثرات بیان کریں گے۔"

میں حج کرنے بھی گیا اور اس کے بعد میں نے مقامات مقدسہ کی زیارتیں بھی کیں۔ تاثرات کیا بیان کروں۔ میری خواہش تھی وہاں بھی عوام اور ان کے مسائل پر تھیں پہنچ پر پہنچے تو مجھے عوام کی حالت دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ایک طرف تو غریبانہ آبادیاں بیماری کی بستی کا سا منظر پیش کرتی ہیں۔ اور دوسری طرف عظیم الشان محلات ہیں۔ دولت اور غربت کا تضاد اپنی انتہا پر نظر آتا ہے۔ ملک میں دولت کی کمی نہیں۔ سعودی عرب کے پاس تو تیل کی دولت بھی ایک ایسی دولت ہے کہ اگر ملک میں عوام کے درمیان اس دولت کی منصفانہ تقسیم ہو جائے تو غربت و ناداری کا نام و نشان مٹ جائے۔ ملک ایک فلاحی مملکت بن جائے۔ لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل ہی اس کے برعکس ہے۔ پیٹرول کی دولت اور اس کے نتیجے میں عیش و عشرت کے تمام وسائل ایک خاندان اور اس کے حواریوں کے قبضے میں ہیں۔ اور عوام کی حالت پاکستان کے عوام سے بھی خراب ہے۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھ کر خانہ کعبہ میں دعا کی تھی کہ دنیا کے پردے میں اندرونی اور بیرونی استبداد کا بیڑہ غرق ہو جائے!

• آپ نے ابھی فلاحی مملکت کا ذکر کیا ہے۔ اس سے آپ کی مراد کیا ہے۔؟

• بہت اچھا کیا کہ آپ نے یہ سوال کر دیا۔ موجودہ حالات میں یہ مسئلہ سمجھنا بھی ضروری ہے۔ میں فلاحی مملکت یا ریاست کی بنیاد تین باتوں پر رکھتا ہوں یعنی عوامی فلاح، حب الوطنی اور جمہوریت۔

میں ان تین باتوں کی وضاحت کرتا چلوں۔ عوامی فلاح سے مراد ہے ملک کی وافر اکثریت یعنی مزدوروں اور کسانوں کی فلاح کا انتظام کیا جائے۔ مزدوروں کسانوں اور ان کی اولادوں کے لئے روٹی روزگار کے ساتھ ساتھ تعلیمی و طبی سہولتوں کی ضمانت دی جائے اور ترقی کے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں۔ حب الوطنی سے مراد ہے کہ ملک کے دشمن کو دشمن اور دوستوں کو دوست سمجھا جائے۔ اس وقت سامراج بالخصوص امریکہ اور امریکی سامراج نواز دنیا بھر کے پاکستان کے عوام کا دشمن ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ملک کی پیٹھ رکھنے اور دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیک کر دوستی کا پیغام دینے کی بجائے ان سے کھلے فوجی معاہدے کرنے کی بجائے ان سے تعلقات منقطع کئے جائیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان ملکوں کی طرف مضبوط اور پر خلوص دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے جو سامراج دشمنی میں پاکستان کا ساتھ دے سکتے ہیں اور کسی کڑے وقت پر کام آسکیں۔ ایسے دوستوں میں عوامی جمہوریہ چین کا نام سر فہرست آتا ہے۔ حب الوطنی کا یہ تقاضا ہے کہ چین سے مستحکم دوستی کا رشتہ استوار کیا جائے اور سامراجی ملکوں سے کئے گئے فوجی معاہدوں اور سیٹو سینٹو جیسی تنظیموں سے ناطہ توڑ لیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ حریت پسندوں اور محب وطن عوام جدید ترمیم پسندی کے خطرے سے ہوشیار رہیں۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی عوامی تحریکات بیدار ہوتی ہیں، سامراجی اور رجعت پسند قوتیں ان کے خلاف میدان میں آجاتی ہیں۔ اس وقت افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ اس نازک مرحلے پر مزدوروں کی عظیم سرزمین روس کی موجودہ قیادت ترمیم پسند ٹولے ان سامراجی اور رجعت پسندوں کی قوتوں سے گٹھ جوڑ کر لیتی ہے اور عوامی تحریک کو پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتی ہے۔ روسی ترمیم پسند ٹولے کے کردار

جناب طفیل عباس عرب ممالک پر اسرائیلی جارحیت کے خلاف احتجاجی جلوس میں

کا یہ گھناؤنا پہلو کئی بار بے نقاب ہو چکا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد اسی ٹولے نے پاکستان کو معاہدہ تاشقند جیسی شرمناک دستاویز پر دستخط کرنے پر مجبور کیا۔ عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کے کاز سے غداری کی اور بالآخر عرب حریت پسند عوام نے روسی حکمرانوں کی نام نہاد دوستی کا سہارا لینے کی بجائے اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے الفتح جیسی تنظیمیں قائم کرکے عوامی جنگ کا آغاز کیا۔ فرانس کی حالیہ عوامی تحریک میں مزدوروں اور طالب علموں کو ناکام بنانے کی کوشش کرکے اور جنرل ڈیگال کے انتخابات کے ڈھونگ کا خیر مقدم کرکے ترمیم پسندوں نے عوام سے کھلی غداری کی ہے۔ چین دوستی کی راہ اختیار کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ترمیم پسندی کو بھی بے نقاب کرنا ہوگا۔

آخری جمہوریت کا مسئلہ آتا ہے۔ جمہوریت سے مراد سیاسی اور معاشی دونوں طرح کی جمہوریت ہے وہ سیاسی جمہوریت جس میں مزدوروں اور کسانوں کی ترقی پسند تحریکات کو کام کرنے کی پوری آزادی ہو ترقی پسند تحریک کے نمائندوں کو ایوانوں میں جانے کے جمہوریت کا مجرم مانگ نہیں لایا جا سکتا۔ یہی جمہوریت وہ ہے جس میں عوامی تحریک مزدور طبقے کی رہنمائی میں آگے بڑھے جس میں کسانوں اور طلباء کی ترقی پسند تنظیموں کو مزدور تحریک کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر چلنے کے مواقع حاصل ہوں۔ یاد رکھئے کہ مزدوروں اور محنت کش عوام کا متحدہ محاذ کبھی بھی رجعت پرست سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے نمائندوں کے ساتھ نہیں بنایا جا سکتا۔ اور اگر بنایا جائے گا تو ناکام ہوگا۔ اور مزدور تحریک کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ سب سے پہلی اور بنیادی شرط مزدور طبقے کی رہنمائی میں مزدوروں اور کسانوں کے متحدہ محاذ کا قیام ہے۔ اس کے بعد ہی دوسرے محب وطن طبقات جن میں قومی سرمایہ دار شامل ہیں۔ اور انفرادی طور پر چھوٹے جاگیردار اور سرمایہ دار بھی اس متحدہ محاذ میں شریک کئے جا سکتے ہیں۔

• طفیل صاحب مزدور طبقے کی تنظیم اور مزدور تحریک کی ترقی میں آپ کا کیا حصہ رہا ہے۔؟

دیکھئے آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں ایئر ویز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ کا صدر ہوں اور اس حیثیت سے میں نے پی آئی اے کے مزدوروں کو منظم کیا اور ان کے مسائل حل کرنے کی اجتماعی کوششیں کیں۔ جن کی تفصیل میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں۔ میں یہ بھی واضح کر چکا ہوں کہ کسی ایک صنعتی ادارے کے مزدور اگر منظم ہو بھی جائیں تو بھی ان کے مسائل پوری طرح حل نہیں ہو سکتے۔ اگر جدوجہد کے بعد تنخواہوں میں کچھ اضافہ کر دیا بھی جائے تو سرمایہ دارانہ نظام کی لعنت کی وجہ سے مزدوروں کی زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ ساتھ ہی ساتھ گرانی بڑھتی جاتی ہے اور مشکلات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ مزدور طبقے کی رہنمائی میں مختلف محب وطن طبقات کی عوامی حکومت بنائی جائے کیونکہ بنیادی چیز یہ ہے کہ کس طبقے کی حکومت ہوتی ہے۔ چاہے پارلیمانی نظام کے تحت یا صدارتی نظام کے تحت وہ ہر حال میں اپنے طبقے کے مفاد میں کام کرتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اکثریت تو نوے فیصد مزدور کسان اور محب وطن طبقات کی ہوتی ہے مگر جو نمائندے منتخب ہوتے ہیں وہ جاگیردار اور سرمایہ دار ہوتے ہیں اور اسی طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں اور ایسے قوانین بناتے ہیں جس سے عوام کے حقوق سلب کئے جائیں۔ ضروری ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کی اپنی ایک ملک گیر تنظیم ہو جو مزدور طبقے کی رہنمائی میں ایک عوامی حکومت قائم کرنے کی باقاعدہ جدوجہد کرے۔ اس مقصد کی غرض سے پی آئی اے کے باشعور مزدوروں کی نمائندہ ایئر ویز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ کی مجلس عاملہ اور جنرل باڈی نے فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان بھر کی ترقی پسند اور آزاد ٹریڈ یونینوں کو منظم کیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے تحت ۱۳ اپریل ۱۹۶۶ء کو کراچی کی ۲۲ یونینوں کے نمائندوں نے کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی داغ بیل ڈالی اور ۱۸ جولائی کو انتخابات میں مجھے کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد اور دوسرے شہروں میں مزدور کمیٹیاں قائم کی گئیں اور ان شہروں کی متعدد ٹریڈ یونینوں نے مزدور کمیٹیوں کے ساتھ الحاق کیا۔

• ۱۹۶۷ء میں گرفتاری کے بعد پھر آپ گرفتار نہیں کئے گئے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

• طفیل صاحب نے چونک کر ہنستے ہوئے کہا کہ نہیں بھائی یہ بات نہیں ہے میں اس کے بعد بھی گرفتار ہوا گرفتاری کی کوششیں بھی ہوئیں۔ ایئر مارشل نور خاں صاحب اور ان کے بعد پی آئی اے کے صدر ایئر مارشل اصغر خاں نے بھی ہمارے موقف سے اتفاق کیا۔ اس دوران میں پولیس نے پوچھ گچھ کے لئے ایئر مارشل اصغر خاں صاحب سے مجھے مانگا تھا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا صرف انٹیلی جنس کے حضرات نے ذاتی طور پر مجھ سے ۱۹۶۸ء میں پوچھ گچھ کی۔ اس سے پہلے جون ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل نے عرب ممالک پر جارحیت کی تھی تو اس کی مذمت کرنے کے لئے کراچی مزدور مرکزی کمیٹی نے طلباء کے اشتراک سے صدر میں ایک جلوس نکالا تھا۔ میں اس میں شریک تھا۔ پولیس نے کسی وارننگ کے بغیر پرامن جلوس پر بے تحاشہ لاٹھی چارج کیا اور پھر رات میں مجھ کو میرے مکان سے گرفتار کر لیا گیا لیکن عوامی دباؤ کے نتیجے میں چند روز بعد مجھے رہا کرنا پڑا۔

• ایک اور اہم بات دریافت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ مزدور تحریک کو ترقی پسند خطوط پر چلانے میں آپ کو حکومت کی مخالفت تو سہنا ہی پڑتی ہے۔ مگر لازمی طور پر ملک کے رجعت پرست طبقے بھی آپ کی مخالفت کرتے ہوں گے۔ اس سلسلے میں بھی کچھ روشنی ڈالئے؟

• جی ہاں! رجعت پرست طبقے تو حکومت سے بڑھ کر مخالف اور دشمن ہیں۔ مخالفت کا آغاز تو اسی وقت ہو گیا کہ جب ہم نے پی آئی اے برانچ کے مزدوروں کے مسائل خوش اسلوبی کے ساتھ حل کروانا شروع کر دیئے لیکن مخالفین اس وقت پیچ و تاب کھانے لگے جب یونین نے مزدور تحریک کے موثر ترجمان کی حیثیت سے ایک ماہنامہ "منشور" کا اجراء کیا اور اس کے ذریعے مزدوروں کا نقطۂ نظر واضح اور دو ٹوک انداز میں پیش کیا جانے لگا۔

> "وہ بت ٹوٹ گیا جس کے سحر نے دس سال تک ملک کو جکڑے رکھا تھا۔ اب تحریک کی باگیں عوام کے ہاتھوں میں ہیں اور رہیں گی"

منشور کی مقبولیت جیسے جیسے بڑھتی گئی رجعت پرست حلقوں کی بوکھلاہٹ میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ملک کی بدنام ترین رجعت پرست جماعت جو خود کو دیدہ دلیری سے "جماعت اسلامی" کہتی ہے۔ منشور کے خلاف باقاعدہ میدان میں نکلی اور اس نے ایک نام نہاد کاغذی تنظیم کے نام سے ایک جہازی سائز کا پوسٹر منشور پر بے بنیاد الزامات لگاتے ہوئے شائع کیا۔ اس کے علاوہ ایک پمفلٹ بھی بڑے پیمانے پر چھپوا کر تقسیم کیا گیا جس کا عنوان تھا "خدا مجرم ہے" (نعوذ باللہ)۔ جماعت کے کارکنوں نے "ملحدوں" کو نشانہ بنانے کی دھمکی دی۔ انہوں نے یونین آفس پر اور میٹنگوں میں یونین کے عہدیداروں اور کارکنوں پر حملے کئے۔ یونین اور یونین کے عہدیداروں کے خلاف مارپیٹ کے اور دوسرے کئی مقدمے دائر کئے۔ یہ مقدمات لڑنے کے لئے مزدوروں کا ہزارہا روپیہ خرچ ہوا اور جماعت کے کارکنوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر قابل نفرت بات یہ تھی کہ ان لوگوں نے خدا کے مقدس گھر کو بھی اپنی گندی سیاست کے لئے استعمال کیا۔ مسجدوں میں منشور اور ہماری یونین کے خلاف وعظ کہلوائے گئے اور ہمیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں جن کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ بہرحال جب سب حربے ناکام ہو گئے تو ..... اس بدنام جماعت نے یونین کے انتخابات میں ہنگامہ آرائی کی۔ میرے خلاف ہینڈ بل تقسیم کئے گئے۔ جن کی زبان خود ان کے لکھنے والوں کی ذہنی پستی کی آئینہ دار تھی۔ ان پوسٹروں اور کتابچوں میں صرف مجھ کو ہی ہدف نہیں بنایا گیا بلکہ میرے خاندان کو بھی گھسیٹا گیا۔ اور پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا۔ بلکہ باقاعدہ غنڈہ گردی کی گئی۔ میرے چھوٹے بھائی پر چاقو سے حملے کی ناکام کوشش کی گئی۔ یونین کے حامیوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے مستقل طور پر داداگیری کا مظاہرہ کیا۔ یونین کے ایک جوائنٹ سکریٹری، مجلس عاملہ کے ایک رکن اور ایک شاپ اسٹیورڈ پر حملہ کر کے ان کو زخمی کیا گیا۔ جب باشعور ساتھیوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو انہوں نے ہر قسم کی غنڈہ گردی کا مقابلہ کرنے کا عہد کیا۔ ہم کو اندازہ تھا کہ رجعت پرست طاقتیں تمام ہتھکنڈے استعمال کریں گی۔ اس لئے مجلس عاملہ کی منظوری سے یونین مجاہدوں کی تشکیل کی گئی تھی۔ یونین مجاہدوں نے مخالفت کے اس دور

میں اپنا کردار بھرپور انداز میں ادا کیا اور کالی بھیڑوں کو مزدور ساتھیوں کے سامنے بے نقاب کیا۔ ان تمام باتوں کے ساتھ جب یونین کے انتخابات ہوئے تو جماعت کے حامیوں کو انتخابات میں حصہ لینے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ وہ عہدیداروں کے انتخابات میں کاغذات نامزدگی تک داخل کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اس کے بعد انہوں نے مجلس عاملہ کے انتخابات میں حصہ لیا لیکن مجلس عاملہ کی پچاس سیٹوں میں سے ایک پر بھی کامیابی نہ حاصل ہوئی۔ اور ستر کے قریب شاپ اسٹیوارڈوں میں جو ان کا ایک آدمی منتخب بھی ہوا تو اس نے خود کو ان سے متعلق ظاہر نہیں کیا بلکہ الٹی اس کی تردید کی۔ اس طرح پی آئی اے کے باشعور مزدوروں نے رجعت پرستی سامراج اور سرمایہ داری کے حامیوں کو عبرتناک شکست دے کر ثابت کر دیا کہ متحد اور منظم

عمر یاد رہے گا۔ یہاں اس حقیقت کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جماعت اسلامی کے گرگوں کی ان تمام مزدور دشمن سرگرمیوں میں نہ صرف حکمران پارٹی کے پیچھے چھپے مہرے اور چلتے ہوئے سکے بلکہ ترمیم پسندوں کے نام نہاد اصولی رہنما بھی برابر کے شریک تھے۔ مگر ہماری ثابت قدمی کے سامنے یہ سب کے سب ناکام و نامراد رہے۔

ایئرویز ایمپلائز یونین پی آئی اے برابر آج بھی مزدوروں کے حقوق کے لئے لڑ رہی ہے۔ اور ہر سال بار بار تنخواہوں میں اضافہ اور دیگر سہولتیں اور الاؤنس حاصل کئے جاتے ہیں۔ اب بھی کچھ مالی مطالبات ہیں جو جلد ہی حل ہو جائیں گے۔ یونین کا ترجمان منشور بڑی دھوم دھام سے نکل رہا ہے اور مزدور نکتہ نظر کی ترویج و اشاعت میں تاریخ ساز کردار ادا کر رہا ہے۔" بزم منشور، کراچی اور بہت سے دوسرے شہروں میں قائم کر کے

پی آئی اے کے مزدور چینی مزدور وفد کے رہنما کا پرجوش استقبال کر رہے ہیں

مزدوروں کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ شکست خوردہ مخالفین نے یکجا ہو کر ایک کاغذی یونین بنائی۔ اس کا حشر بھی خراب ہوا۔ پی آئی اے کے مزدوروں نے قطعی قبول نہیں کیا چند روز تک ڈرگ کالونی میں ایک بورڈ پر اس یونین کا نام نظر آتا رہا۔ مگر اب وہ ایک مدت سے غائب ہو چکا ہے۔ اب وہ پھر یہ سلسلہ شروع کر رہے ہیں جس کا جواب اب کی دفعہ پی آئی اے کے مزدور بھرپور انداز میں دیں گے جو ان کو ساری

تاہم منشور سے تعلق پیدا کیا گیا ہے۔

پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

میرا سوال ختم ہونے سے پہلے ہی بیگم طفیل نے اندر سے کچھ کہا اور طفیل صاحب ہنستے ہوئے بولے "فی الحال تو پیٹ کی صورت حال کا مسئلہ درپیش ہے" یہ کہہ کر وہ اندر گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ خود کھانا لا کر دسترخوان پر لگا رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے کہا "ابھی میرے ذہن میں آپ سے دریافت طلب کئی سوال کلبلا رہے ہیں۔" کہنے لگے "آپ پوچھے جائیے میں بھی بتانے میں کنجوسی نہیں کر رہا ہوں۔ آپ جو کچھ پوچھیں گے اس سے کچھ زیادہ ہی بتا رہا ہوں گا۔" پھر کھڑے ہی کھڑے انگڑائی لیتے ہوئے بولے "آپ نے پاکستان کی سیاسی صورتحال کے بارے میں میرے خیالات دریافت کئے تھے۔ بھائی صاحب ۱۹۴۷ء میں انقلاب کے نعرے لگے تھے۔ پھر ملک آزاد ہوا پاکستان بنا مگر اس پر پورا قبضہ سرمایہ دار جاگیردار طبقے کا رہا۔ آج بھی بہت کچھ نعرے لگ رہے ہیں۔ جمہوریت ...؟"

انہوں نے طنز سے "جمہوریت" کے لفظ کو حرفوں میں طویل کرتے ہوئے کہا "جمہوریت کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صحیح جمہوریت مزدور طبقے کی رہنمائی میں مزدور کسان کا اتحاد قائم کئے بغیر نہیں ہو سکتی۔ سیاسی آزادی کا جھنڈا مزدور طبقہ کی رہنمائی میں ہی اٹھایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ طبقہ جانتا ہے کہ اس کے پاس کھونے کے لئے اپنی غلامی کی زنجیروں کے سوا کچھ نہیں اور پانے کے لئے پوری دنیا پڑی ہے۔"

اکتوبر میں کراچی کے طلباء نے ہفتۂ مطالبات منا کر تحریک کا آغاز کیا تھا۔ یہ تحریک چند ہی دنوں میں پورے پاکستان میں پھیل گئی۔ ان ہی دنوں میں پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو مغربی پاکستان کا سرکاری دورہ کر کے عوامی بیداری کی لہر دوڑا رہے تھے۔ شراب حریت دو آتشہ ہو گئی آمریت سے متنفر آزادی کے متوالوں نے اپنے مظاہروں سے پورے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے سمجھا کہ مسٹر بھٹو کو دیوار زنداں کے پیچھے دھکیلنے سے شاید عوامی سیلاب کے آگے بند باندھا جا سکے گا۔ چنانچہ ۱۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو مسٹر بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا۔ مسٹر بھٹو کی گرفتاری کے بعد ۱۷ نومبر تک ایک سناٹے اور جمود کی سی کیفیت طاری رہی۔ بڑے بڑے جغادری سیاستدان منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ عین اس وقت جب کچھ لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ طلباء کی پگھلائی ہوئی برف ایک بار پھر جم جائے گی۔ ایک بم پھٹ پڑا، ۱۷ نومبر کو ائیر مارشل اصغر خاں نے سیاست کے میدان میں آنے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی ساتھ عملی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا اور لوگوں نے برملا طور پر کہنا شروع کر دیا کہ اب لوہے کو لوہا کاٹے گا۔ پگھلی ہوئی برف میں بہاؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اُدھر مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی نے تحریک کو شدت دی اور عوامی جد و جہد کے دھارے میں ناقابل یقین تیزی و تندی آ گئی۔ اس دھارے کی زد میں آ کر اونچے اونچے محل زمیں بوس ہو گئے۔ وہ بت ٹوٹ گیا جس کے سحر نے دس سال تک ملک کو جکڑے رکھا تھا۔ اب تحریک کی باگیں عوام کے ہاتھوں میں ہیں اور رہیں گی۔ طلباء کی موجودہ تحریک اس بڑی عوامی جد و جہد کا ہی ایک حصہ ہے اس لئے کہ عام طالب علم محنت کش عوام کے بچے ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان مسائل کا شکار رہتے ہیں، جن کا سامنا ان کے والدین کو ہوتا ہے۔ ان مسائل کا حل بالا بالا طور پر حکومتیں بدلنے سے نہیں ہو سکتا۔ جب ۱۹۵۸ء میں مارشل لا لگا تھا تو کچھ لوگوں کو خوشی ہوئی تھی۔ مگر اس وقت بھی میرا خیال یہی تھا کہ کوئی مثبت تبدیلی نہ ہو گی۔" انہوں نے میرے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہا "میں ایک مثال دیتا ہوں، کسی گاؤں کو لوٹنے کے لئے ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے حملہ کیا۔ واپسی میں جب گروہ جنگل میں پہنچا تو آپس میں لوٹ کے مال پر جھگڑا ہونے لگا اور اس طرح دو گروہ بن گئے۔ جو طاقتور گروہ تھا وہ مال لے کر چلا گیا۔ کمزور گروہ والے واپس گاؤں پہنچے اور گاؤں والوں سے کہا کہ ہم پر بڑا ظلم ہوا ہے ڈاکو ہم سے سارا مال چھین کر لے گئے تم ان سے مال واپس دلانے میں ہماری مدد کرو۔ اس وقت یہ مثال جمہوری مجلس عمل کی بعض پارٹیوں پر صادق آتی ہے۔ جب وہ برسر اقتدار تھیں۔ تو ملک کے عوام کو لوٹتی رہیں۔ جب اقتدار چھن گیا تو یہ دوڑ کر عوام کے پاس گئیں کہ دیکھو ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ مگر آج عوام ہوشیار ہو چکے ہیں اور انہوں نے اس خبد ریا خلط سے بچنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس وقت عوامی طاقتوں کا ابھار ایک اچھی مثال ہے اور اس سے آئندہ کے لئے اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔"

"مروجہ مزدور قوانین کے بارے میں بھی اظہار خیال کرتے چلئے۔"

"مزدور قوانین تو اب تک مزدوروں کو کچلنے کے لئے بنائے جاتے رہے ہیں اور موجودہ قوانین تو انتہائی ناقص ہیں۔ مزدوروں سے ہڑتال کا حق چھین لیا گیا ہے۔ حق ہڑتال نہ ہونے سے تو مزدوروں میں اور بھی انجماد پیدا ہوتا ہے۔ مزدور قوانین پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ مزدوروں سے ہمدردی کے دعوے کرنے والے لوگ عملاً کیا کر رہے ہیں۔ اگر کسی کو محنت کشوں سے پیار ہے، ان کی عظمت کا اعتراف ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ اسے مزدور دشمنوں سے نفرت ہو۔"

"آئیے اب کچھ بین الاقوامی باتیں ہو جائیں۔ میں یو این او کے موجودہ کردار سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔"

اس سوال پر بے ساختہ ہنستے ہوئے انہوں نے کہا "کسی نے کہا تھا کہ یو ایس اے کا یو ہے اس میں اور باقی تو نو ہی نو" تو بات بالکل صحیح تھی۔ یو این او صرف امریکی سامراج کے مفادات پورے کرنے کا ایک آلہ ہے۔ چھوٹے ملکوں کے مفادات سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ انسان کو کچلنا اس کا شیوہ ہے۔ ہونے کو تو روس بھی یو این او کا رکن ہے مگر اپنے ترمیم پسند کردار کی بنا پر وہ بھی امریکی سامراج کا حاشیہ بردار بنا ہوا ہے۔ اس وقت یو این او میں کسی سامراج دشمن ملک کی شمولیت ضروری ہے تاکہ وہ سامراجی منصوبوں کی راہ میں مزاحمت کر سکے۔ بھلا بتائیے دنیا کے ایک چوتھائی آبادی رکھنے والے ملک چین کو یو این او میں نمائندگی نہیں دی جاتی۔ اس لئے کہ اگر چین کو نمائندگی دی گئی تو امریکی سامراج کے ناپاک منصوبوں کی تکمیل میں رکاوٹیں پڑنا شروع ہو جائیں گی۔ جب تک چین جیسے عظیم ملک کو یو این او میں نمائندگی نہیں ملتی اس کا وجود بیکار ہے۔"

"امریکہ میں صدارتی انتخاب کے بعد جناب نکسن برسر اقتدار آئے ہیں۔ کیا

امریکہ کے زوال کا اعتراف خود اس کے صدر فرماتے ہیں کیسی بلندی کیسی پستی! یہی حشر برطانوی سامراج کا ہو چکا ہے۔ وہ سلطنت جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا آج اس کے اقتدار کا سورج ڈوب چکا ہے۔ یہ تاریخ کا ارتقائی عمل ہے۔ سامراجیت کو لازماً زوال پانا ہے اور یہ بات ہے کہ سامراجی ملکوں میں اندرونی اور باہمی تضادات برابر بڑھ رہے ہیں اور یہ نظام اپنی بھیانک قبر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دنیا بھر کے انقلابی عوام اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سامراجی اور ان کے حواری تمام رجعت پرست کاغذی شیر ہیں۔ آج دنیا تیزی سے کروٹ بدل رہی ہے۔ ممکن ہے کہ ۱۹۸۰ء تک دنیا کا نقشہ ہی بدل جائے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ سب کچھ نہ تو خود بخود ہو رہا ہے نہ ہوگا۔ رجعت پرستی اور سامراجیت کی طاقتیں تاریخ کے اسٹیج سے از خود نہیں اتریں گی۔ انقلابی عوام ان کو ٹھوکریں مار مار کر نیچے دھکیل دیں گے۔ جب تک سامراجیت اور رجعت پرستی کے بتوں پر بھرپور وار نہیں کیا جائے گا وہ گریں گے نہیں۔ رجعت پرست بظاہر طاقتور نظر آتے ہیں مگر چونکہ انہیں عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوتی اس لئے بے حد کمزور بھی ہوتے ہیں۔ امریکی سامراج کو اپنے قریب المرگ ہونے کا احساس ہو چلا ہے یہی وجہ ہے کہ نکسن نے مسخرانہ انداز میں چیخ کر کہا کہ امریکہ "فتحیاب ہوگا" اور اتنا مضبوط ہوگا جتنا ہم چاہیں گے اور اس وقت تک رہے گا، جب تک ہمیں ضرورت ہوگی۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکسن کو اپنے پیشرو کے بنائے ہوئے راستے پر چلنا پسند ہے، پھر بین الاقوامی پالیسیاں کیا ہوں گی یہ بات خود ظاہر ہے۔"

"امریکہ کے بعد عالمی سیاست میں روس کا نمبر آتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اور دوسری جگہوں پر روس کا جو کردار رہا ہے اس پر آپ روشنی ڈالیں گے۔"

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مشرق وسطیٰ میں روس نے کھوکھلی اور جھوٹی حمایت جتا کر عرب عوام سے صریح غداری کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں دیکھئے ۹ جنوری کو قاہرہ میں عرب اقوام کی حمایت میں دوسری بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تھی اس میں روس کی حکمران ٹولی نے مشرق وسطیٰ کے مسئلے پر سمجھوتے کے لئے ایک پانچ نکاتی منصوبہ بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا تھا اس میں سیکیورٹی کونسل کے نومبر ۱۹۶۷ء کی قرارداد کو مشرق وسطیٰ کے مسئلے کے حل کی کنجی قرار دیا تھا۔ حالانکہ یہ قرارداد امریکہ اور روس کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھی۔ روسیوں نے یہ بھی کہا کہ اب مشرق وسطیٰ کا مسئلہ ایک ایسی منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں سے اس کے "پرامن" تصفیے کی راہ نکل سکتی ہے ورنہ ـــــ "دھماکہ خیز کشیدگی خطرناک حد تک بڑھ جائے گی۔" کانفرنس میں یوگوسلاویہ اور بھارت کے وفود نے روس کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن عربوں کی تنظیم آزادی الفتح کے وفد نے کہا کہ یہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کی سیکیورٹی کونسل قرارداد کو واضح طور پر مسترد کرتے ہیں۔" انہوں نے روسی

آپ سمجھتے ہیں کہ اب امریکہ کی بین الاقوامی پالیسیوں اور جنگ ویتنام کی صورت حال میں کوئی تبدیلی ہوگی۔

نکسن صاحب نے برسراقتدار آنے کے بعد زبردست انتخابی خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اب امریکہ ایک "منصفانہ اور فارغ البال معاشرے" کے قریب جا پہنچا ہے۔ ظاہر ہے کہ نکسن تو ابھی برسراقتدار آئے ہی ہیں تو پھر امریکہ اس منصفانہ اور فارغ البال معاشرے کے قریب جانسن کے دور میں ہی پہنچا ہوگا۔ ذرا جانسن کے دور کا جائزہ لیجئے تو پتہ چلے کہ وہ معاشرہ کیسا ہے۔ جانسن نے اعتراف کیا تھا کہ گزشتہ پانچ سال میں بڑی کمپنیوں کا منافع پچاس فیصد بڑھ گیا۔ ۱۹۶۷ء میں پانچ بڑی کمپنیوں کا سرمایہ دو کھرب بیاسی ارب سے بڑھ کر تین کھرب سترہ ارب ڈالر ہوگیا۔ دوسری طرف عوام کی حالت قابل رحم حد تک خراب ہوگئی۔ بیروزگاروں کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی۔ بھوکے رہنے والوں کی تعداد ایک کروڑ سے بھی زائد ہوگئی اور خط افلاس سے بھی پست حالت میں رہنے والوں کی تعداد تین کروڑ سے تجاوز کر گئی۔ ان حالات کا سب سے زیادہ شکار افرو امریکی عوام ہوئے جنہوں نے مجبور ہو کر ڈیٹرائٹ اور دوسرے شہروں میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ خود جانسن نے اپنے ملک کے عوام کا خون چوس چوس کر اپنی ذاتی دولت میں ایک کروڑ ڈالر سے زائد رقم کا اضافہ کر لیا۔ امریکہ کے لئے یہ بات بھی نئی نہیں ہے۔ اس سے پہلے بہت سے امریکی صدر یہی کچھ کرتے رہے ہیں۔ جانسن صاحب نے اسی روایت پر عمل کیا۔ اس صورت حال کے متعلق مدت پہلے عظیم لینن نے کہا تھا کہ امریکہ میں مٹھی بھر مغرور ارب پتی ہیں جو عیش و عشرت کے حجرے میں جھول رہے ہیں اور لاکھوں عوام ہیں جو مسلسل بھک منگوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہاں مٹھی بھر کروڑ پتیوں کا نہیں بلکہ ارب پتیوں کا راج ہے جبکہ عوام افلاس اور غلامی کا شکار رہیں۔ یہ ہے امریکہ کا "منصفانہ معاشرہ" پھر یہ دیکھئے کہ غلہ سمندروں میں بہا دیا جاتا ہے، گوداموں میں سڑایا جاتا ہے مگر عوام کی بھاری تعداد فاقے کرتی رہتی ہے۔ یہ ہے ان کا فارغ البال معاشرہ۔" امریکی معاشرے کی تعریف کے ساتھ ہی ساتھ نکسن صاحب نے امریکہ کے گرتے ہوئے وقار کا رونا بھی رویا ہے دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکی لیڈر بیسویں صدی کو غرور و تکبر کے نشے میں "امریکی صدی" کہتے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں امریکی صدر ٹرومین نے متکبرانہ انداز میں کہا تھا کہ امریکہ نے اپنے کاندھوں پر عالمی قیادت کی اتنی بڑی ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے جتنی بڑی ذمہ داری چنگیز خان، سیزر اور نپولین بونا پارٹ پر بھی نہیں رہی تھی۔ مگر آج نکسن کی تقریر سے محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ کی عظمت میں سوراخ ہو چکے ہیں۔ اور اس کی ہوا تیزی سے نکل رہی ہے اور اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ خود امریکی صدر یہ اعتراف کرنے لگے ہیں: "امریکہ "جذباتی بحران" میں مبتلا ہوگیا ہے۔" یہ وہی امریکہ ہے جس نے گزشتہ دو عالمی جنگوں میں دنیا بھر سے بے پناہ سرمایہ سمیٹا تھا۔ امریکی حکمران ایک ہاتھ میں ڈالر اور دوسرے میں ایٹم بم لے کر دنیا بھر پر قبضہ کرنے کے لئے پاگل کتے کی طرح دوڑ رہے تھے۔ مگر آج اسی

اور امریکی تجاویز یا سیاسی سمجھوتے کی کسی بھی شکل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس قسم کی تمام تجاویز فلسطینی عوام کا اپنی مادر وطن کو آزاد کرنے کا حق سلب کر لیتی ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اس کانفرنس کے پیغام تہنیت میں سوویت وفد نے فلسطین کے مسئلے کا ذکر تک نہ کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوویت روس کے ترمیم پسند حکمرانوں نے یہ کانفرنس عرب عوام کے مفادات پیچ ڈالنے کی غرض

فریضہ حج کی ایک یادگار تصویر

سے منعقد کرائی تھی۔ شام کے وفد کے سربراہ نے کانفرنس کو متنبہ کر دیا تھا کہ وہ سیکورٹی کونسل کی مذکورہ بالا قرارداد قبول کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھے کانگو کے وفد نے کہا کہ "اگر آپ عرب اقوام کی حمایت خلوص دل سے کر رہے ہیں تو آپ فلسطینی عوام کی مسلح جدوجہد آزادی کی حمایت کیوں نہیں کرتے؟" ان حالات میں روسی وفد کو منہ چھپانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

یہ حقیقت اب تو بالکل ہی واضح ہو چکی ہے کہ روس کی ترمیم پسند حکمراں ٹولی امریکی سامراج سے اطاعت پرستانہ گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ اس سے پہلے کوسیجن نے خود امریکہ جا کر گلاسبرو میں امریکی سامراج کے اس وقت کے سربراہ جانسن سے عرب عوام کے مفادات پر سودے بازی کی تھی۔ نکسن کے انتخاب پر کریملن کے غداروں نے غلامانہ انداز میں ان کو خوش آمدید کہا۔ انہوں نے اپنے نام نہاد عوامی رہنماؤں کا ایک وفد امریکہ بھیجا تاکہ وہ بین الاقوامی مسائل اور سوویت امریکی تعلقات پر تبادلۂ خیال کر سکے اس کو انہوں نے خود اپنے الفاظ میں بین الاقوامی مسائل حل کرنے کے لئے ایک "مشترکہ کوشش" کہا۔ روس کے سرکاری ترجمان پراودا کے سیاسی مبصر جارجی ژدخوف نے واشنگٹن جا کر امریکی کانگریس کے سرکردہ اراکین سے خفیہ گفتگو کی جس پر برطانوی اخبار ایوننگ اسٹینڈرڈ نے لکھا کہ سوویت دوڑ بھاگ کی تیزی اور شدت نے بہت سے ماہرین کو متحیر کر دیا ہے۔ اس اخبار نے ایک امریکی افسر کا یہ جملہ بھی لکھا کہ "حالات بڑے خوش آئند ہیں میں نے روسیوں کو کبھی اتنی عجلت میں نہیں دیکھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ

مثال پیش کی ہے۔ سارا مغربی پریس روسی اقدامات پر انگشت بدنداں تھا۔ "یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ" نے تو صاف صاف لکھ دیا کہ "کریملن صرف یہ چاہتا ہے روس اور امریکہ ایک معاہدہ کر لیں جس کے ذریعے دنیا کو مفاد اور اثر کے دو حلقوں میں بانٹ دیا جائے اور کہیں کہیں نو مینز لینڈ جھگڑے بازی کے لئے چھوڑ دی جائیں۔"

اس وقت روس میں رعایت یافتہ بورژوا طبقے کے مٹھی بھر افراد نے ریاستی اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے اور روسی ترمیم پسند حکمراں ٹولی ان کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس ٹولی نے پرولتاریہ کی آمریت ختم کر کے رکھ دی ہے اور اس کی جگہ عوام کے وسیع طبقوں یعنی مزدوروں کسانوں اور انقلابی دانشوروں پر بورژوا طبقے کی آمریت مسلط کر دی ہے۔ اس بورژوا ڈکٹیٹر شپ کے تحت لا اینڈ آرڈر اور نظم و ضبط کا مطلب استحصالی طبقوں کے مفاد کا تحفظ کرنا اور مظلوم طبقوں کو لوٹنے کھسوٹنے میں ان کی مدد کرنا ہے اور اپنی اس ساری کارگزاری کو وہ "پوری قوم کی حکومت" کہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے امریکی سامراج امریکی عوام کو کچلنے کے لئے اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو "جمہوری اقدامات" کہتا ہے۔ روسی ترمیم پسند حکمراں ٹولی "پوری قوم کے لئے تنظیمی کام کے قواعد" بنا کر اپنی موت کے وارنٹ پر خود دستخط کر رہی ہے۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پیرس مذاکرات سے ویت نام کا مسئلہ حل ہو سکے گا؟"

"میں سمجھتا ہوں مذاکرات کے ذریعے ایسے مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے" طفیل صاحب نے کھڑے ہو کر ٹہلتے ہوئے کہا۔ "امریکی سامراج جنگ باز ہے اس کی معیشت کا بڑا انحصار جنگی صنعتوں پر ہے۔ اس کی عالمی حکمت عملی جنگ پسندی کی حکمت عملی ہے۔ امریکہ نے دنیا بھر میں دو سو سے زائد جنگی اڈے قائم کر رکھے ہیں اور اس کے جنگی اخراجات اسی ارب ڈالر کے لگ بھگ ہیں۔ اس وقت دنیا میں جہاں کہیں بھی جنگ چھڑتی ہے اس میں امریکی سامراج کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ جنگیں اسی وقت ختم ہو سکتی ہیں جب امریکی سامراج کے ہاتھ کاٹ دئے

جائیں اور سرکچل دیا جائے۔ امریکی سامراج بھوکا بھیڑیا بن کر کمزور اقوام کے سامنے آتا ہے مگر اب اس کے بہروپ کھل چکے ہیں۔ دنیا بھر کے عوام جو کتنے ہو چکے ہیں۔ ویت کانگ اور الفتح کی تنظیمیں ابھر چکی ہیں اور ایسی مزید تنظیمیں ابھریں گی، وہ وقت اب دور نہیں کہ سامراجی اور ترمیم پسند طاقتیں بری طرح شکست کھا جائیں گی، اس کے بعد ہی دنیا میں ویت نام سے لاطینی امریکہ تک پائیدار امن قائم ہو سکے گا۔"

"بہت باتیں ہو گئیں طفیل صاحب" میں نے قلم رکھتے ہوئے کہا۔ رسماً تو مجھے ادارہ منشور کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے انٹرویو کے لئے اس قدر طویل وقت دیا ہے۔"

"تکلف چھوڑیئے" طفیل صاحب بات کاٹتے ہوئے بولے، "میں دو چار باتیں اور کہنا چاہتا ہوں میری طرف سے وہ بھی لکھ لیجئے۔" یہ باتیں رجعت پرست طاقتوں کے خلاف بغاوت کرنا محنت کش طاقتوں کا حق بھی ہے اور فرض بھی ہیں ہر چیز کو طبقاتی نظر سے دیکھنا چاہیئے اور عوام کو طبقاتی اعتبار سے بیدار اور منظم کرنا چاہیئے تاکہ عوام پر بیرونی یا اندرونی طور پر وقت آ پڑے تو وہ متحد ہو کر اس کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہماری فوج محب وطن ہے اور ہر بیرونی حملے کے خلاف موثر مدافعت کے لئے ہر وقت سینہ سپر ہے لیکن عوام کو بھی اپنی محب وطن فوج کے دوش بدوش لڑنے کیلئے عوامی فوج کی صورت میں منظم ہونا ضروری ہے۔"

اس طویل انٹرویو سے جسم تھک گیا تھا مگر ذہن تازہ ہو گیا تھا بیشمار گتھیاں جو میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھیں سلجھ گئی تھیں اور بہت سے ایسے گوشے میرے سامنے آ گئے تھے جن تک پہلے میری نظر ہی نہ پہنچی تھیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا طفیل صاحب کی چھوٹی بچی جو کھیلتے کھیلتے ان کی گود

۲۸ جولائی ۱۹۶۵ء کو طفیل عباس پی۔ آئی۔ اے کے ایک جلسہ عام سے تقریر کر رہے ہیں، بائیں طرف اس وقت کے جنرل سکریٹری محمد اقبال علوی کھڑے ہیں

ہمارے اپنے وطن اور ہماری اپنی روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس وقت ملک میں صورتحال یہ ہے کہ عوام کو اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے جائز حقوق تک حاصل کرنے میں شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص راشن کارڈ بھی بنوانا چاہے تو بسا اوقات اسے رشوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رشوت کی لعنت عام ہو چکی ہے یہاں تک کہ یہ زہر انصاف کے حصول میں بھی کارفرما نظر آتا ہے، حکومت تو خیر اب بدلے گی ہی مگر بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ پوری مشنری کو اوور ہال کیا جائے۔ ان تمام چور دروازوں کو بند کیا جائے جن کے ذریعے رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کو کھلا راستہ ملتا ہے تطہیر کی مہم میں ضلعی حکام سے لیکر چپڑاسیوں تک پورے ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت ہے اگر یہ ڈھانچہ نہ بدلا گیا تو کوئی بھی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوگا اور عوام میں ایک بار پھر مایوسی اور بددلی پیدا ہو جائے گی۔ عوام ہی قوت متحرکہ ہوتے ہیں انہوں نے تاریخ کے نظام کو تبدیل کیا ہے۔ وطن کی ترقی کے لئے جدوجہد کرنا اور

میں آ بیٹھی تھی۔ اپنی ننھی ننھی مٹھی میں ایک کھلونا لئے ہوئے مسکرا مسکرا کر طفیل صاحب کو دکھا رہی تھی۔ طفیل صاحب کے چہرے پر بھرپور شفقت کا عکس پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ خوبصورت سا کھلونا جس نے اس معصوم بچی کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیر دی ہیں موجودہ نظام نے بے شمار ننھے ننھے بچوں کو ایسے کھلونوں سے محروم کیا ہوا ہے۔ ان بچوں کے چہروں پر دکھ کی لکیریں ہیں۔ لیکن یہ صورتحال تو صرف آج ہے۔ کل۔ نئی نسل کے چہرے پر معصوم مسکراہٹیں ہوں گی اس لئے کہ اس وقت تک ہونٹوں سے تبسّم چھین لینے والا سرمایہ دارانہ نظام دم توڑ چکا ہوگا، ننھے منے بچوں کے ہاتھوں میں رنگ برنگے دلفریب کھلونے بھی ہوں گے۔ ان کے چہروں کے کنول دکھوں کی دھوپ سے نہیں مرجھائیں گے۔ ان کے ہونٹوں کا تبسّم محرومی کے درد سے ماند نہیں ہوگا ـــ

دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ

کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے زیر اہتمام عظیم الشان جلوس اور جلسۂ عام

ہمارے مطالبات :- ○ معاشی و سماجی مساوات ○ ہمارا پروگرام عوامی جمہوریت ○ مانگ رہا ہے ہر انسان - روٹی کپڑا اور مکان ○ روٹی کپڑا سب کو دو - ورنہ گدی چھوڑ دو ○ سیاسی قیدیوں کو رہا کرو ○ ظلم و تشدد بند کرو ○ ہنگامی حالت ختم کرو ○ کالے قانون ختم کرو ○ دفعہ ۱۲ ختم کرو ○ حق ہڑتال بحال کرو ○ ناقص مزدور قوانین منسوخ کرو ○ روزگار سب کو دو۔

کراچی ۱۳ر فروری (نمائندہ منشور) کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے اعلان کے مطابق کمیٹی ۱۳ر فروری کی تاریخ ساز ہڑتال میں اپنے پروگرام کے تحت بھرپور حصہ لے گی۔ کمیٹی کے دفتر واقع منگھو پیر روڈ پر صبح سویرے ہی مختلف یونینوں کے مزدور جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ۹ بجے کمیٹی کے قائم مقام جنرل سکریٹری واحد بشیر کی صدارت میں مزدوروں کا جلسۂ عام دفتر کے سامنے منعقد ہوا۔ جلسے سے مشتاق شہزاد صدر آدم سلک ملز ورکرز یونین۔ محمد اسمعیل صدر [illegible] سلک

ملز لیبر یونین نور بخش صدر کریم سلک ملز ورکرز یونین اور رضی الدین حیدر صدر شاہیمار سلک ملز مزدور یونین نے خطاب کیا۔ مقررین نے ملک میں موجود عوامی بیداری پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے۔ عوامی مطالبات کی جدوجہد میں مزدور طبقے کی طرف سے بھرپور حصہ لینے کے عزم کا اعادہ کیا اور اس ہیجانی دور میں۔ ملز مالکان کی طرف سے مزدوروں کی اندھا دھند چھانٹی۔ قانون کی بدنام دفعہ ۱۳ کے تحت علیحدگی کے نوٹس جاری کئے جانے اور دوسرے ظالمانہ ہتھکنڈوں کو عوام اور مزدوروں کے خلاف سازش قرار دیتے ہوئے ملز مالکان کو متنبہ کیا کہ وہ مزدوروں کو ظلم و تشدد اور بیروزگاری کی آگ سے کھیل رہے ہیں جس کے بڑے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور ان کی پوری ذمہ داری سرمایہ داروں پر عاید ہوگی۔ مقررین نے ہزاروں مزدوروں کی جبری بے روزگاری کے مسئلے پر لیبر ڈپارٹمنٹ کی خاموشی پر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے محکمۂ محنت اور دوسرے متعلقہ حکام سے مطالبہ کیا کہ وہ مزدوروں میں پھیلے ہوئے اشتعال کو حقیقی معنوں میں ختم کرنیکے لیے ر۔ چھانٹیوں۔ برطرفیوں کے نوٹس اور دوسرے ظلم و تشدد کا خاتمہ کرکے ہوشمندی کا ثبوت دیں۔

پی آئی اے یونین کے آرگنائزنگ سیکرٹری اور کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر صغیر احمد نے بھی تقریر کی اور کہا کہ آج کل ہڑتال پاکستان میں تاریخ ساز حیثیت رکھتی ہے آج ملک میں عوامی مطالبات کے سلسلے میں پورا کاروبار بند ہے۔ انہوں نے تالیوں کی گونج میں یہ اطلاع دی کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ملک میں ہوائی سروس بھی ہڑتال پر ہے اور بارہ کروڑ عوام اپنا حق حاکمیت طلب کر رہے ہیں اب آمریت اپنے انجام سے نہیں بچ سکتی۔ آج عوام اپنے مطالبات کو حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ کسان جاگیرداری کی سڑی ہوئی لاش کو دفن کرنے اور ملک سے جاگیرداری رشتے ختم کرکے زمین پر کسانوں کے حقوق ملکیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ طالب علم تعلیم کو عام کرنے اور سامراجی مفادات کے علمبردار نظام تعلیم کی تنسیخ اور طالب علموں پر آمرانہ پابندیوں اور تعلیم پر حکومت اور سرمایہ داروں کے کنٹرول کو ختم کرنے کی شاندار جدوجہد کر رہے ہیں، کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی رہنمائی میں ہم بھی۔ حق ہڑتال کی بحالی، انجمن سازی کی آزادی اور تمام شہری آزادیوں کی بحالی مزدور دشمن قوانین اور دفعات کی منسوخی ملک سے جاگیردارانہ معیشت کے خاتمے۔ بالغ حق رائے دہی اور ایسی حکومت کے قیام کے مقصد کے لئے جو صرف اور صرف عوامی جمہوریت کے پروگرام سے حاصل ہو سکتا ہے، مقدور بھر جدوجہد کر رہی ہے۔ اور اس مقصد کیلئے کام کرنے والے افراد اور جماعتوں کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ لیکن آج پھر پاکستان کے عوام کو دھوکا دینے کیلئے کچھ جماعتیں حکمران آمریت سے سودے بازی کر رہی ہیں اور ایک نئے معاہدۂ تاشقند کی سازش ہو رہی ہے۔ لیکن ہم عوام سے غداری کرنے والے عناصر کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس وقت پوری قوم بیدار ہے اور وہ عوامی مطالبات سے غداری کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی اور جب تک عوام کے مطالبات پورے نہیں ہو جاتے لڑائی جاری رہے گی

صدر جلسہ واحد بشیر نے عوامی مطالبات کے لئے لڑی جانے والی لڑائی میں مزدور طبقے کو رہنمایانہ کردار ادا کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ ملک میں عوامی جمہوریت لانے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ پاکستان کے عوام مزدور طبقے کی قیادت اور کسانوں سے اشتراک عمل کے ذریعے مسلسل جدوجہد کریں۔ انہوں نے مزدوروں سے سرمایہ داروں کی تنظیم دشمن سازشوں کا بھرپور جواب دینے کی اپیل کی اور کہا کہ ہم کسی مزدور کو بے روزگار نہیں دیکھنا چاہتے اور جو ملز مالک مزدور کو بے روزگار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ہم ان سے پورے وسائل کے ساتھ لڑیں گے۔

جلسۂ عام کے بعد پروگرام کے مطابق مزدوروں کا ایک عظیم الشان جلوس دفتر سے روانہ ہوا۔ جس کی قیادت واحد بشیر اور صغیر احمد نے کی جلوس ٹھکو بیرڈ روڈ جہانگیر آباد۔ ناظم آباد چورنگی۔ گرومندر لسبیلہ پل سے ہوتا ہوا دیپ چند اوجھا روڈ پر دفتر جوائنٹ ڈائریکٹر لیبر ویلفیئر پر ختم ہوا جلوس کے راستے پر عوام نے پرجوش تالیوں اور تحسین و آفرین کے نعروں سے خیرمقدم کیا، اور جلوس پر جا بجا پھول برسائے گئے۔ جلوس کے شرکا اپنے ہاتھوں میں پرچم اور پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے، جن پر یہ نعرے درج تھے۔ "ملک ملوں میں چھانٹی بند کرو۔" برطرفی کے نوٹس واپس لو۔" ظلم و تشدد بند کرو۔" ناقص مزدور قوانین منسوخ کرو۔" عوامی مطالبے پورے کرو۔" سیاسی قیدیوں کو رہا کرو۔" ہمارا مطالبہ سیاسی و معاشی مساوات" ہمارا پروگرام عوامی جمہوریت"" مانگ رہا ہے ہر انسان، روٹی کپڑا اور مکان"۔ روٹی کپڑا سب کو دو۔ ورنہ گدی چھوڑ دو"۔ جلوس کے شرکا بڑے جوش و خروش کے ساتھ یہ اور دوسرے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے، جگہ جگہ طالب علموں کی طرف سے جلوس کی حمایت میں طلبہ مزدور کسان اتحاد زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔

جلوس کے اختتام پر دفتر جوائنٹ ڈائریکٹر لیبر ویلفیئر واقع دیپ چند اوجھا روڈ پر واحد بشیر کی صدارت میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے ایروڈیز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ کے آرگنائزنگ سیکرٹری صغیر احمد نے سلک ملوں کے دس ہزار مزدوروں کی برطرفی نوٹسوں کے ذریعہ متوقع بے روزگاری پر محکمۂ محنت کی پراسرار خاموشی کی سخت مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ سلک ملوں سے چھانٹیاں بند کروانے اور سلک مزدوروں کے مسائل اجرتوں میں کمی جھوٹے الزامات کی چارج شیٹنگ اور ڈسمسل آرڈرز کا سلسلہ فوری بند کروانے کے لئے فوری اقدامات عمل میں لائے۔ انہوں نے کہا کہ کراچی مزدور مرکزی کمیٹی موجودہ ناقص مزدور قوانین کی منسوخی حق ہڑتال کی بحالی تمام بنیادی انسانی حقوق تحریر و تقریر اور حق رائے دہی کے حقوق دئے جانے اور ملک میں حقیقی معاشی مساوات کے تحت صحیح معنوں میں عوامی جمہوریت قائم ہونے تک عوامی جدوجہد میں شامل رہے گی۔ انہوں نے متنبہ کیا کہ اگر کسی جماعت یا گروہ نے عوامی مطالبات کے سلسلے میں [illegible] بازی کی کوشش کی تو قوم انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ طالب علم رہنما

تسنیم الحسن فاروقی نے طالب علم برادری اور مزدور ساتھیوں کے دوش بدوش عوامی بیداری پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے کہا کہ طالب علموں، مزدوروں اور کسانوں کے مسائل پر معاہدہ تاشقند کی حرکت برداشت نہیں کیجائیگی انہوں نے تمام سیاسی قیدیوں بشمول ۔ رشید حسن خاں، ممتاز جعفری علی باور، ضیاء اللہ کی غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کیا ۔ صدر جلسہ جناب واحد بشیر نے اپنے اتحاد ۔ اور تنظیم کا بھرپور مظاہرہ کرنے پر مزدور ساتھیوں کو مبارکباد دی اور امید ظاہر کی کہ مزدور کمیٹی کی رہنمائی میں مزدور اپنی طبقاتی جدوجہد آخری فتح تک جاری رکھیں گے انہوں نے رحمٰن انڈسٹریز کے

بارہ غیر قانونی برطرف کئے جانے والے نمائندوں کی غیر مشروط واپسی کا مطالبہ کرتے ہوئے ملز مالکان کو یاد دلایا کہ یونین توڑنے اور مزدوروں کو انتشار کا شکار بنانے کی کوششوں کا نتیجہ خود سرمایہ داروں کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہوگا جلسۂ عام کی ان کارروائیوں کے بعد پُر امن منتشر ہو گیا ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد حکمران جماعت سے متعلق افراد اور غنڈوں نے اس علاقے میں راہ گیروں پر پتھراؤ کر کے فضا کو زہر آلود بنا دیا اور بعد میں ان غنڈوں کے ہاتھوں دو چار شہری زخمی ہوئے ۔

پُر امن شہریوں کیخلاف غنڈہ گردی حکمران جماعت کرا رہی ہے

مزدور مرکزی کمیٹی کی جانب سے اوچھے ہتھکنڈوں کی مذمت

کراچی (نمائندہ منشور) کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے جنرل سکریٹری واحد بشیر نے لسبیلہ گولیمار کے علاقوں میں دو گروہوں میں تصادم کے نتیجے میں گولی لگنے سے ایک آدمی کے ہلاک اور ۱۲ آدمیوں کے زخمی ہونے کی ریڈیو پاکستان سے ۱۳ فروری کو نشر ہونے والی خبر کو انتہائی شر انگیز قرار دیا ہے ۔ انہوں نے کہا کہ حقیقت حال یہ ہے کہ کراچی مزدور مرکزی کمیٹی نے ۱۳ تاریخ کو موجودہ ظالمانہ ، آمرانہ نظام کے خلاف احتجاج کرنے اور ملک گیر ہڑتال کو کامیاب بنانے کیلئے ایک جلوس نکالا تھا ۔ جو منگھو پیر روڈ، پاک کالونی، پہلی چورنگی، گولیمار اور لسبیلہ کے علاقوں سے مارچ کرتا ہوا ۔ لیبر ڈائرکٹریٹ پہنچا ۔ لیبر ڈائرکٹریٹ کے سامنے ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا جس میں ملک کی صنعت میں موجودہ نام نہاد بحران کے نتیجے میں مزدوروں کی چھانٹی، لیبر ڈائرکٹریٹ کے عملے کی غیر جانبدار پالیسی، ناقص مزدور قوانین اور حق ہڑتال کی ضبطی کے خلاف اظہار ناراضگی کیا گیا ۔ جلسے میں حقیقی عوامی رہنماؤں اور کارکنوں کی مسلسل نظر بندی کی حالت میں صدر ایوب اور حزب اختلاف کے درمیان ۱۳ تاریخ کی مجوزہ بات چیت کے نتیجے میں "عہد نامہ تاشقند" کے دہرائے جانے کے خطرے سے بھی عوام کو خبردار کیا گیا ۔ اور یہ عہد کیا گیا کہ اپنے حقوق کے مکمل حصول اور موجودہ آمرانہ حکومت میں عوامی خواہشات کے مطابق مثبت بنیادی تبدیلیاں لانے کیلئے مزدور اپنی جدوجہد مسلسل جاری رکھیں گے ۔

انہوں نے مزید کہا کہ اس کے بعد جلسہ پُر امن طور پر ختم کر دیا گیا اور جب لوگ اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے تو اچانک حکمران پارٹی کے کرائے کے غنڈوں نے نہتے اور پر امن راہ گیروں پر حملے شروع کر دئے ۔ انہوں نے کالی جھنڈیاں لگی ہوئی چند گاڑیوں کو بھی نقصان پہنچایا ۔ راہ گیروں میں چونکہ زیادہ تر تعداد گولیمار کے علاقے میں رہنے والوں کی تھی اس لئے جب دوسرے لوگ ان غنڈوں کے ظلم کے شکار پُر امن لوگوں کو بچانے کے لئے لسبیلہ پہنچے تو ان غنڈوں نے ان نہتے لوگوں پر فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں ایک آدمی ہلاک اور بارہ دوسرے زخمی ہو گئے ۔

انہوں نے کہا کہ حکمران پارٹی اپنے خلاف ہر انقلابی طبقے اور گروہ کی مشترکہ جدوجہد سے گھبرا کر ذلیل ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے اور کراچی جیسے کاسموپولیٹن شہر میں صوبائی عصبیت کو ہوا دے کر پُر امن شہریوں کے سکون کو غارت کرنے اور ان کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کی شر انگیز سازش کر رہی ہے ۔ چنانچہ انہوں نے عوام کے ہر طبقے، گروہ اور مختلف زبانیں بولنے والے عوام سے حکمران پارٹی کے کرائے کے غنڈوں کے پھیلائے ہوئے فتنے کو "پٹھان ۔ مہاجر" فساد کا رنگ دینے کی ذلیل سازش سے ہوشیار و خبردار رہنے اور اپنی صفوں کو انتشار سے بچانے کیلئے متحد رہنے کی اپیل کی ۔

حاضری الاؤنس ۔ بس کا کرایہ ۔ بند لوم کا پیسہ اور ڈائننگ پرنٹنگ کے کاریگروں کو وردیاں فراہم کی جائیں ۔ عدالت کا فیصلہ

کراچی، ۱۱ فروری (نمائندہ منشور) مغربی پاکستان صنعتی عدالت دوئم کراچی نے ۔ نور سلک ملز لیبر یونین کے اٹھائے ۱۳ مطالبات کے متعلق تنازعے پر فیصلہ دے دیا ہے ۔ جس کے مطابق مزدوروں کو سال بھر میں اٹھارہ با تنخواہ چھٹیاں تہواری چھٹیوں کے پیسے اوسط اجرت کے مطابق دئے جائیں ۔ مزدوروں کو ڈیڑھ مہینہ بلا تنخواہ چھٹیاں اور خاص ضرورت کے تحت مزید چار مہینے کی

بلا تنخواہ چھٹیوں کا حق دیتے ہوئے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ڈائنگ اور پرنٹنگ کے کاریگروں کو وردیاں فراہم کی جائیں اور تمام کاریگروں کو ڈیڑھ روپیہ روزانہ چکنائی الاونس دینے پانچ روپے ماہانہ حاضری الاونس اور فیکٹری سے تین میل سے زیادہ دور رہنے والوں کو دس روپے ماہانہ کنونس الاونس دینے کا بھی حکم دیا گیا ہے ۔ علاوہ ازیں ایک لوم بند ہونے کی صورت میں چالو لوم کی اجرت کاریگر کو دئے جانے اور دونوں لوم بند کی شکل میں تنخواہ کے اوسط کے مطابق اجرت دینے۔ اور جابروں کو تنخواہ دس سے پندرہ روپے روز کے درمیان اور غیر جابروں کی تنخواہ ساڑھے سات سے دس روپے روزانہ کے درمیان دی جانے کا ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ نورسلک ملز لیبر یونین نے ۲۰ر اپریل ۱۹۶۷ء میں یہ تنازعہ اٹھایا تھا۔ اور اس میں اکیس مطالبات شامل تھے۔ جن میں سے آٹھ مطالبے یونین نے دوران تنازعہ واپس لے لئے تھے ۔ اس تنازعے کے دوران مالکان کی درخواست پر ان کے حق میں فیصلہ ہونے کی بنا پر یونین کے جنرل سکریٹری جوائنٹ سکریٹری ۔ نائب صدر اور رکن مجلس عاملہ کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا ۔ عدالت میں مزدوروں کی نمائندگی ۔ کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے جنرل سکریٹری اشرف حسین رضوی ، ابن ایوب اور واحد بشیر صاحبان نے کی ۔ مالکان کی طرف سے مسٹر محمود لے خنی پیش ہوئے۔

کھاد فیکٹری ملتان کے مزدوروں کی بے مثال ہڑتال

نو دن تک کارخانے پر مزدوروں کا قبضہ رہا

ملتان ۱۸ر فروری (نمائندہ منشور) مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن، کھاد فیکٹری ملتان کے مزدوروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے ۸ر فروری صبح چار بجے سے جو ہڑتال شروع کی تھی وہ ۱۷ر فروری کو مطالبات کی منظوری کے بعد ختم کر دی گئی ہے ۔ کامیابی کے لحاظ سے یہ ہڑتال اپنی مثال آپ تھی کیونکہ ۹ دن کے عرصہ ہڑتال میں کارخانہ اور اس سے ملحقہ رہائشی کالونی پر مزدوروں کا مکمل قبضہ رہا ۔ اور اس طرح مزدوروں نے پرامن طور پر بڑی کامیابی سے نظم و نسق سنبھال کر یہ ثابت کر دیا کہ مزدور طبقہ ملک کے نظام حکومت کو چلانے کی پوری پوری اہلیت رکھتا ہے ۔

اس ہڑتال کا پس منظر یہ ہے کہ کھاد فیکٹری لیبر یونین کی قیادت میں مزدور تقریباً ایک سال سے اپنے مسائل کو حل کرنے کی جد و جہد کر رہے تھے ۔ مگر نوکر شاہی ذہنیت رکھنے والے چند افسران کی ہٹ دھرمی اور کچھ مفاد پرست افراد کی موقع پرستی کے باعث مزدوروں کی تکالیف میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا ۔ یونین کے عہدیداروں اور سرگرم کارکنوں کو برطرفیوں چارج شیٹوں تبادلوں غرضیکہ طرح طرح کی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا جاتا رہا ۔ ناکارہ مزدور قوانین کے باعث مزدوروں کے مسائل کو عدالتی چارہ جوئیوں کے گورکھ دھندوں میں الجھایا جاتا رہا ۔ اگر مزدوروں کے حق میں صنعتی عدالت سے کوئی فیصلہ ہو بھی جاتا تو انتظامیہ اس پر عمل درآمد کرنے سے صاف انکار کر کے عدالت کا منہ چڑاتی یا ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں اپیلیں کر دیتی ۔

مزدوروں کے درمیان نفاق اور انتشار پھیلانے کیلئے انتظامیہ اپنے پالتو افراد کے ذریعہ پاکٹ یونینوں کے "جھنڈے" بھی کھڑی کرتی رہی اور ان کو نمائندہ تسلیم کر کے ان سے طویل مدتوں کے نام نہاد معاہدے کرتی رہی ۔ انتظامیہ کی ہٹ دھرمی اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ عدالت کے حکم اور لیبر یونین کے حق میں ۸۲ فی صدی مزدوروں کے رائے دینے کے باوجود لیبر یونین کو نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا رہا۔

آخر کار ۱۳ر نومبر ۶۷ء کو یونین نے مزدوروں کے مسائل پر مشتمل ہڑتال نوٹس دے دیا۔

مطالبات میں تنخواہوں میں پچاس فیصدی اضافہ ۔ خوراک الاونس ۔ ڈسٹ الاونس ۔ گیس الاونس ۔ شفٹ الاونس ۔ طبی الاونس چھٹیوں کی تعداد میں اضافہ ۔ کرایہ مکان ۔ واشنگ الاونس ۔ یونین کو تسلیم کئے جانے کا مطالبہ اور برطرف شدہ مزدوروں کی بحالی وغیرہ شامل تھے۔

ہڑتال نوٹس کے جواب میں انتظامیہ نے یونین کے جنرل سکریٹری کو برطرف کر کے غیر قانونی تالہ بندی کا اقدام کیا ۔ محکمہ محنت کے افسران نے بھی مصالحتی کارروائی کرنے کے بجائے ڈھائی مہینے ہڑتال نوٹس کی قانونی حیثیت کا فیصلہ کرنے میں لگا دئے اور یہ فیصلہ بھی ۲۸ر جنوری کو مزدوروں کے جلسوں جلوسوں اور مظاہروں کے دباؤ کے بعد کیا گیا۔ مصالحتی کارروائی کے دوران انتظامیہ اپنی ضد پر اڑی رہی اور کوئی قابل قبول فارمولا ماننے سے انکار کرتی رہی ۔ اس دوران مقامی حکام نے بھی مصالحتی کارروائی میں حصہ لیا ۔ مگر بے سود ۔ انتظامیہ "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کا پیکر بنی رہی ۔ اس دوران مزدور اپنے مطالبات کی حمایت میں شہر اور کالونی میں جلسے جلوس اور مظاہرے بھی کرتے رہے جس سے انہوں نے شہریوں اور طالب علموں کی حمایت حاصل کی۔

آخر کار ۱۷ فروری کو صبح چھ بجے مزدوروں نے اپنے شاندار اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کام بند کر دیا اور کارخانے کے پھاٹکوں۔ کالونی گیٹ اور کالونی میں تمام اہم مقامات پر مورچے سنبھال لئے تاکہ انتظامیہ اور اس کے ایجنٹوں کی سازشوں کو ناکام بنایا جاسکے۔ اس دوران یونین کے سرگرم کارکنوں نے نظم و نسق سنبھال کر پاکستان کے مزدور طبقے کے لئے قابل تقلید مثال قائم کردی۔ کالونی کے باشندوں بشمول افسران کو پانی، بجلی اور دیگر سہولتوں کی فراہمی برابر جاری رہی۔ ہڑتال کے دوران پاکٹ یونین کے تمام عہدیداروں نے ماسوائے ایک فرد کے لیبر یونین میں شمولیت اور پاکٹ یونین کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ ہڑتال کے دوران میں کالونی اور شہر میں متعدد جلسے جلوس اور مظاہرے کئے گئے۔ جن میں لیبر یونین کے کارکنوں کے علاوہ مقامی مزدور رہنماؤں خصوصاً راؤ اشفاق احمد خاں اور رانا محمد اقبال بوٹا۔ پاک امریکن فرٹیلائزرز مکوڑی داؤدخیل کے صدر جناب خدا بخش ڈوگر کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے جنرل سکریٹری اشرف حسین رضوی اور ایک کارکن محمد علی، طالب علم رہنماؤں خصوصاً عارف محمود قریشی صدر نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن ملتان اور منظر مہدی وغیرہ نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ جلسوں کے دوران متعدد قراردادوں میں مزدور رہنماؤں نے پاکستان کے مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور دانشوروں کے متحدہ محاذ کے ذریعے سرمایہ داری، جاگیرداری اور سامراج کے خلاف جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا عزم کیا۔ علاقے کی مختلف مزدور انجمنوں کے علاوہ طالب علموں، کسانوں اور وکلاء نے ہڑتالی مزدوروں کی حمایت میں قراردادیں منظور کیں۔

۱۸ فروری کو کراچی سے ڈبلیو پی آئی ڈی سی کے ڈائرکٹران جناب محمد نسیم سی ایس پی اور جناب محمد اکرم کی آمد پر دوبارہ مصالحتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ مگر یہ بات چیت بھی ناکام رہی اور مزدوروں کی ہڑتال جاری رہی۔ آخر کار ۲۵ فروری کو مزدوروں اور انتظامیہ کے درمیان گفتگو کے بعد ہڑتال کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا، معلوم ہوا ہے کہ انتظامیہ نے مزدوروں کے کئی مطالبات منظور کر لئے ہیں (تفصیلات آئندہ شمارے میں)

دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ

طبقاتی شعور کی بنیاد پر مرکزی مزدور وفاق کا قیام ناگزیر ہے (طفیل عباس)

کریم سلک ملز ورکرز یونین کا یوم تاسیس

کراچی ۱۹ فروری (نمائندہ منشور) کراچی مزدور مرکزی کمیٹی اور ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ کے صدر طفیل عباس نے مغربی پاکستان کی بنیاد پر طبقاتی شعور کی بنیاد پر منظم یونینوں پر مشتمل ایک مضبوط۔ فعال اور ترقی پسند فیڈریشن کے قیام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس یقین کا اظہار کیا کہ مزدور کمیٹی جس انداز میں مزدوروں میں کام کر رہی ہے۔ اس میں موجود کچھ خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود صحیح تعین سمت اور با مقصد نقطۂ نظر کی بدولت اس کی جدوجہد کے امید افزا نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور اب مغربی پاکستان میں مرکزی کمیٹی کے پروگرام اور منصوبے کے مطابق بہت جلد مرکزی تنظیم کا قیام عمل میں آنے کی امید ہے۔

انہوں نے ملک بھر میں طالب علموں۔ مزدوروں، کسانوں اور عوام کی جانب سے آمریت۔ افسر شاہی۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف عوامی مطالبات کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے عوامی مطالبات کی پوری پوری حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ مزدور طبقے کو چاہئے کہ کسانوں اور طالب علم ساتھیوں کے دوش بدوش عوامی تحریک کی رہنمائی کی صلاحیت اپنے آپ میں پیدا کرے۔ ہمارے لئے اس وقت پوری طرح چوکس رہنے کی ضرورت ہے ورنہ اس بات کا پورا اندیشہ موجود ہے کہ ہماری دی ہوئی قربانیاں رائیگاں چلی جائیں اور تحریک انقلاب دشمنوں کے ہتھے چڑھ جائے۔ انہوں نے کہا کہ کراچی مزدور مرکزی کمیٹی اپنے سیاسی نظریئے کے مطابق مزدور مفاد کے منافی قوانین کی تنسیخ ملک سے جاگیردارانہ معیشت کے خاتمے۔ انجمن سازی اور تمام شہری آزادیوں کی بحالی اور بالغ حق رائے دہی کے حق اور عوام کے حق حاکمیت پر عمل در آمد کے لئے عوامی جمہوریت کیلئے موثر تحریک چلانے کا پروگرام طے کر چکی ہے اس پروگرام پر عمل میں جو بھی جماعت یا فرد تیار ہوگا اسے ہماری حمایت حاصل رہے گی۔ جناب طفیل عباس نے کریم سلک ملز ورکرز یونین کی تین سالہ جدوجہد کو سراہتے ہوئے مزدوروں اور مزدور کارکنوں کو مشورہ دیا کہ یونین کے ساتھ ساتھ محلوں میں بھی مزدوروں اور عوام میں کمیٹی کے اغراض و مقاصد کیلئے کام کریں۔

ان سے پہلے کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے آفس سکریٹری حیات الدین نے کریم سلک ملز ورکرز یونین کی تیسری سالگرہ کے موقع پر یونین کی طویل

کارگزاریوں کی رپورٹ پیش کی اور بتلایا کہ اس دوران یونین نے کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی رہنمائی میں مزدوروں نے اپنی جدوجہد کے ذریعے بونس، چھٹیوں میں اضافہ وغیرہ کے مطالبات حاصل کئے۔ اور ان کی جدوجہد کی روشنی میں بہت سی جگہوں کے مزدوروں نے اپنی تنظیمیں قائم کیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس یونین میں انتشار پھیلانے کی کوشش مختلف عناصر کی جانب سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ لیکن مزدوروں نے ہمیشہ اپنے شاندار اتحاد سے ان کوششوں کو ناکام بنایا۔ اس جدوجہد میں ہمارے بہت سے ساتھیوں کو غنڈہ گردی جھوٹے مقدمات میں ماخوذ ہونے اور اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انہوں نے کہا کہ یونین اب پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط فعال اور نمائندہ حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اور ہمارے دوسرے ڈیپارٹمنٹوں کے وہ تمام ساتھی یونین کے ممبر بن چکے ہیں جو ابھی تک ممبر نہیں تھے۔

جلسۂ عام سے اقبال سلک ملز ورکرز یونین کے جنرل سکریٹری محمد فاروق شالیمار سلک ملز مزدور یونین کے صدر رضی الدین۔ ایئر ویز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ راولپنڈی کے مرزا کیانی۔ اور ڈھاکہ برانچ کے جنرل سکریٹری مولانا مزمل حق نے بھی خطاب کیا۔ اور کریم سلک ملز کے مزدوروں کی جدوجہد کو سراہتے ہوئے امید ظاہر کی ایک دن تمام مزدور طبقہ ایک پرچم تلے اپنے حقوق غاصبوں سے چھیننے کے قابل ہو جائے گا۔

کریم سلک ملز ورکرز یونین کے جنرل سکریٹری واحد بشیر نے کاریگروں کی تنخواہوں میں غیر قانونی کٹوتی اور مزدوروں میں انتشار پھیلانے کی حرکتوں کی پرزور مذمت کی اور مینجمنٹ سے مطالبہ کیا کہ وہ مزدوروں کے لئے نئے مسئلے پیدا کر کے حالات خراب کرنے کی پالیسی ترک کرے۔ ورنہ کاریگروں میں پھیلی ہوئی بے چینی سے پیدا شدہ نتائج کی ذمہ داری کمپنی پر عائد ہو گی۔

کریم سلک ملز کے ایک مزدور شاعر کانپوری نے اپنی نظم اتحاد و تنظیم پیش کی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ نظم کا ایک بند ہے ۔

یک جہت رہو اب کہ تقاضائے وفا ہے
بدلی ہوئی دنیا و سیاست کی ہوا ہے
دنیا کی معیشت پہ عجب وقت پڑا ہے
دولت کے پرستاروں نے اندھیر کیا ہے
اب شعلِ تنظیم جلاؤ کہ سحر ہو
بات ایسی کہو جس میں قیامت کا اثر ہو

جلسے کے آخر میں صدر یونین و اجلاس جناب نور بخش نے برادر یونینوں اور باہر کے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔ ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی رہنمائی میں کریم سلک ملز ورکرز یونین مزدور مسائل کے لئے اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ انہوں نے ویونگ کے کین جابروں اور دوسرے نئے اراکین کے خلاف سازش کی افواہوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یونین کسی مزدور پر ظلم و زیادتی کو برداشت نہیں کرے گی۔ اور مزدوروں کے مسائل پر بھرپور جدوجہد کرتی رہے گی۔ انہوں نے مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ اپنے شاندار اتحاد کو مزید مضبوط بنانے کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔

ریلوے مزدوروں کے مطالبات کی حمایت کا اعلان
کراچی مزدور مرکزی کمیٹی

کراچی ۱۰ فروری (نمائندہ منشور) کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے ایک اعلامیہ میں جو آج اشاعت کیلئے اخبارات میں تقسیم کیا گیا ویسٹ پاکستان ریلوے ورکرز یونین کی جانب سے مغربی پاکستان ریلوے کے وائس چیئرمین کو ایک میمورنڈم کے ذریعے کے بھیجے مطالبات جس میں بنیادی تنخواہ کم از کم تنخواہ سو روپے ہاؤس رینٹ الاؤنس، علاج کی بہتر سہولتوں کی فراہمی سستی اشیاء کی دکانوں میں یونین کی نگرانی میں شریک کرنے مہنگائی الاؤنس، تنخواہوں میں اضافہ چالیس گھنٹے کا ہفتہ مقرر کرنے کے مطالبات بھی شامل ہیں۔ کی بھرپور حمایت کی جاتی ہے، محکمہ ریلوے کو کروڑوں روپے منافع کما کر دینے والے مزدوروں کے یہ مطالبات بالکل جائز۔ منصفانہ اور فوری حل طلب نوعیت کے ہیں۔ اس لئے ان مطالبات کو فوری تسلیم کیا جانا چاہئے۔ تاکہ دکھ درد اور آلام میں مبتلا مزدوروں کی شکایات رفع ہو سکے۔

اساتذہ کی
گورنر مغربی پاکستان سے اپیل

اساتذہ جنہیں معمار قوم کے لقب سے نوازا گیا ہے موجودہ مہنگائی کے دور میں ان کی اقتصادی حالت اتنی ناگفتہ بہ ہے کہ وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ بمشکل بھر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشی بدحالی کا شکار ہیں۔ حالانکہ یہ قوم کی گاڑی کے پہیے ہیں۔ اگر گاڑی کے پہیے بیکار ہو جائیں تو گاڑی کیونکر چلے گی؟ انتہا تو یہ ہے کہ میٹرک پاس کلرک ترقی کرتے کرتے کلاس (۱۱) آفیسر بن سکتا ہے لیکن میٹرک پاس مدرس جے۔ وی کی ٹریننگ کرنے کے باوجود ۱۰۰-۵-۱۴۰ کے گریڈ میں تعینات کیا جاتا ہے اور اسی گریڈ میں ریٹائر ہو جاتا ہے۔

صرف ایم اے یا ایم ایس سی پاس لیکچررز کے گریڈ میں تعینات کیا جاتا ہے لیکن اگر وہی شخص بدقسمتی سے بی ایڈ کرے تو اسے ۲۲۰-۱۵-۳۱۰-۱۵-۴۰۰ کا گریڈ دیا جاتا ہے اور یہی حالت دوسرے اساتذہ کی بھی ہے۔

ہمارا مطالبہ ہے کہ تعلیم کی بہتری اور بہبود کے لئے اساتذہ کے گریڈوں پر نظر ثانی کی جائے۔ اور انہیں محکمانہ ترقیاں دی جائیں جن میں تعلیمی قابلیت اور مدرسی کے لحاظ رکھا جائے اور پرانے اساتذہ کو مدرسی کے لحاظ سے بھی ترقیاں

دی جائیں۔

اساتذہ کیلئے مندرجہ ذیل ٹیچرز گریڈ تجویز کیا جاتا ہے

(i) ٹیچرز گریڈ: ۱۰۰۰ - ۱۰۰ - ۲۵۰ - ۱۰ - ۳۰۰ - ۲۰ - ۵۰۰ - ۲۵ - ۷۵۰

(i) بی ٹی سی ڈرل ماسٹرز اور دینیات ماسٹر کو ۳۰۰ روپیہ ماہوار سے آغاز کیا جائے

(ii) ایس وی او ٹی، ڈرائنگ ماسٹرز، اسسٹنٹ ورکشاپ انسٹرکٹرز اور جونیئر فزیکل ڈپلومہ ہولڈر کو ۲۵۰ روپیہ ماہوار سے آغاز کیا جائے۔

(iii) سی ٹی بی ٹی، ورکشاپ انسٹرکٹرز، سینئر فزیکل ڈپلومہ ہولڈرز ڈسٹرکٹ فزیکل سپروائزر اور فزیکل ڈائریکٹر کو ۴۰۰ روپیہ ماہوار سے آغاز کیا جائے۔

(ii) - تمام ہیڈ ماسٹرز کو سینئر کلاس (i) اور بی۔ ایڈ اساتذہ کو کلاس (ii) کا درجہ دیا جائے۔

(iii) ہیڈ ماسٹرز کو ۱۰۰ روپیہ اسپیشل تنخواہ دی جائے، جیسا کہ کالج پرنسپل کو دی جاتی ہے۔

(iv) تمام اساتذہ کے بچوں کو تمام مدارج پر مفت تعلیمی سہولتیں دی جائیں۔

(v) اساتذہ کے بچوں کے لئے مختلف درس گاہوں میں علیحدہ نشستیں مخصوص کی جائیں۔ نیز ان کے لئے وظائف کا الگ کوٹہ مقرر کیا جائے۔

(vi) دوسرے محکموں کی طرح محکمہ تعلیم میں بھی اساتذہ کے بچوں کو تعیناتی میں سبقت و ترجیح دی جائے۔

(vii) اساتذہ اور ان کے بچوں کو سفری سہولتیں کم کرائے پر دی جائیں نیز دوران تعطیلات Recreation allowance دیا جائے۔

(viii) تمام اساتذہ کو ۲۰ روپیہ ماہوار میڈیکل الاؤنس تنخواہ کے ساتھ دیا جائے

(ix) اساتذہ کو رہائشی سہولتیں دی جائیں یا انہیں ۴۰ روپیہ ماہوار کے حساب سے کرایہ مکان دیا جائے۔

(x) بنے وولینٹ فنڈ کی ادائیگی کی منظوری ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات کے اختیار میں دی جائے۔

امید واثق ہے کہ حکومت مغربی پاکستان اساتذہ کی گوناگوں مشکلات اور کام کی اہمیت کے پیش نظر ان کے مطالبات پر ہمدردانہ غور کر کے منظور فرمایا جائے۔

(منجانب: عبدالرحمٰن اعوان۔ صدر [illegible] ماسٹرز ایسوسی ایشن [illegible])

اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ ورکرز یونین

کراچی مزدور مرکزی کمیٹی میں شامل ہوگئی

مزدور طبقہ کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی رہنمائی میں اپنا مقصد حاصل کرسکتا ہے (نور جمال سیکرٹری جنرل)

کراچی ۲۸ فروری (نمائندہ منشور) کراچی کے مایۂ ناز فولاد سازی کے کارخانے اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ کے مزدوروں نے اپنی یونین کا الحاق کراچی مزدور مرکزی کمیٹی سے کرنے کا تاریخی فیصلہ کرتے ہوئے یونین مذکور کا الحاق ۲۳ فروری کو ایک شاندار تقریب میں کیا۔ جس میں کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے صدر طفیل عباس، قائم مقام جنرل سیکرٹری واحد بشیر، پاکستان پیپلز پارٹی کے تنظیمی کمیٹی کے ممبر معراج محمد خان وغیرہ نے بھی شرکت کی تھی۔ اسٹیل کارپوریشن ورکرز یونین کے جنرل سیکرٹری جناب نور جمال نے آج ایک بیان اخبارات کے نام جاری کیا۔ جس میں کہا گیا کہ یونین اور مزدوروں کو اپنی مشکلات اور بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ جس کے لئے مخلص، نڈر اور بے لوث قیادت کی ضرورت تھی یہ مقصد صرف اور صرف کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کی مرکزی تنظیم میں شمولیت سے پورا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم نے بالکل بروقت یونین کا الحاق مرکزی کمیٹی سے کیا ہے۔ اور ہمیں اس پر پورا یقین ہے کہ ہم کمیٹی کی رہنمائی میں اپنے مسائل بالخصوص ۱۹۶۳ء میں منظور شدہ ہیٹ الاؤنس کے لاکھوں روپے کے واجبات کمپنی سے وصول کرتے رہیں گے۔ انہوں نے ملک کا اعلیٰ ترین اداروں، ہائیکورٹ و سپریم کورٹ کے واضح فیصلوں کے باوجود جو معزز عدالتوں نے ہیٹ الاؤنس سے جان چھڑانے کی خاطر داخل کردہ اپیلوں پر مینجمنٹ کے خلاف دئے ہوتے ہیں۔ دیدہ دانستہ طور پر ہیٹ الاؤنس کے بقایاجات کی ادائیگی سے گریز مینجمنٹ کی ہٹ دھرمی کی اور ان کے اس اقدام کو عدالت۔ انصاف اور قانون کے عدم احترام پر مبنی قرار دیا۔ اور اس معاملے پر محکمہ محنت کی خاموشی پر حیرت و تعجب کا اظہار کرتے ہوئے محکمہ محنت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس مسئلے پر اپنے اختیارات استعمال کرے کسی قسم کے دباؤ میں ہرگز نہ آئے۔ تاکہ مزدوروں میں پھیلی ہوئی بے چینی کا سد باب ہو سکے۔ ورنہ اس سلسلے میں پیدا ہونے والے لازمی ردعمل کی ذمہ داریوں میں مینجمنٹ کے ساتھ ساتھ محکمہ محنت بھی اس میں شامل ہوگا جناب نور جمال نے کراچی مزدور مرکزی کمیٹی کے پروگرام کی تشکیل منظم یونینوں اور غیر منظم مزدوروں کی طبقاتی ٹریڈ یونین تنظیم تمام غیر جمہوری اور کالے قوانین۔ مزدور دشمن دفعات و قوانین کو منسوخ [illegible] صنعتی تنازعات میں